غبار کارواں

اشرف صبوحی دہلوی

مکتبہ دانیال

غبارِ کارواں

اشرف صبوحی دہلوی

غبارِ کارواں

مکتبہ دانیال

طبع — اوّل

تعداد — ایک ہزار

قیمت — پانچ روپے پچھتر پیسے

طابع — مشہد آفسٹ پریس

ناشر — ملک نورانی

مکتبہ دانیال

وکٹوریہ چیمبر ۲ صدر کراچی ۳

فہرست مضامین

اِنتساب

میں دہلی کے شمائلِ قدیم کی اس حکایتِ لطیف کو دہلی ہی کے ایک مایۂ ناز اور نامور فرزندِ عالی جناب حکیم حافظ محمّد سعید صاحب (ستارۂ امتیاز) صدر ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن کے نام نامی سے منسوب کرتا ہوں جو پاکستان میں اُس دہلی کی تہذیب، ثقافت، شرافت اور عظمتِ رفتہ کا ایک ایسا عکسِ جمیل ہیں جس کی یاد بُھلائے نہیں بُھول سکتی۔

نیازمند
اشرف صبوحی دہلوی

پیش لفظ

از جناب سیّد وقار عظیم ایم۔اے

دلّی جسے کسی نے شہر کہا، کسی نے نگر اور کسی نے دیار —— بس بس کر اُجڑنا اور اجڑ اجڑ کر بسنا اس کا ازلی مقسوم ہے۔ بسنے اور اُجڑنے اور اُجڑ کر پھر بسنے کی یہ کہانی "سو مرتبہ" دہرائی گئی۔ ۱۷۰۰ء کے بعد سے مرہٹوں، جاٹوں، احمد شاہ ابدالی اور نادر شاہ جیسے مہم جو حملہ آوروں نے پے در پے دلّی پر حملے کئے اور ہر حملے میں اس کا سہاگ اجاڑ کر چلے گئے —— لیکن دلّی کے سہاگ کو یوں بار بار اُجاڑنے والے اسے اجاڑنے میں کامیاب نہ ہوئے، اس لئے کہ دلّی کا سہاگ جس کا دوسرا نام "دہلویت" ہے، یا آپ چاہئے تو اسے دلّی پن کہہ لیجئے اجاڑنے اور مٹانے کی ہر نئی مہم کے ساتھ نئے سر سے زندہ ہوا۔

"دہلویت" ایک مخصوص معاشرتی اور تہذیبی مزاج کا نام اور اس کی جیتی جاگتی علامت ہے اور اس مزاج میں مرہٹوں، جاٹوں، ابدالیوں اور نادر شاہوں کے حملے سے جو تغیر پیدا ہوتا ہے وہ محض عارضی ہے۔ دہلویت پردوں میں جا چھپتی ہے، فنا نہیں ہوتی —— اور اس کی وجہ یہ ہے کہ تغیر و انقلاب کے ہر دور میں چند ایسی ہستیاں ہوتی ہیں جو اسے مٹنے سے بچاتی رہتی ہیں۔ یہ ہستیاں ہیں جن کے وجود سے خانقاہیں، محفلیں اور

حویلیاں آباد ہیں اور جن کے وجود سے 'دہلویت' کا وجود قائم ہے۔ ان کے اُٹھنے، بیٹھنے، چلنے پھرنے، بولنے چالنے اور کبھی کبھی اُٹھتے بیٹھتے، چلے پھرے اور بولے چالے بغیر خاموشی سے ایک گوشے میں بیٹھے رہنے سے یہ دہلویت زندہ ہو کر ہماری آنکھوں کے سامنے آتی ہے اور ہم بڑی آسانی سے پہچان لیتے ہیں کہ یہ 'دہلویت' ہے۔ یہ دہلویت جب گھر سے باہر نکلتی ہے تو "پھول والوں کی سیر" میں، عید بقرعید کے میلوں ٹھیلوں میں، پیروں اور ولیوں کے مزاروں کے اردگرد اور جامع مسجد کی سیڑھیوں پر اپنا جلوہ دکھاتی ہے۔ یہ دلّی کا اجتماعی جلوہ ہے۔ دلّی کو جب کوئی مٹانا چاہتا ہے تو دہلویت کا یہ جلوہ سمٹ کر خانقاہوں، دیوان خانوں اور حویلیوں کی چار دیواریوں میں پناہ لیتا ہے۔ اور وہ ہستیاں جن کے دم قدم سے ان خانقاہوں، دیوان خانوں اور حویلیوں کی دنیا آباد ہے دہلویت کو اپنی آغوش میں دبے کر اسے زندہ رکھتی ہیں اور دلّی کا دیار اُجڑ اُجڑ کر بھی آباد رہتا ہے اور یوں دہلویت یا اس کا معاشرتی اور تہذیبی مزاج دلّی کے مٹ جانے پر بھی زندہ و تابندہ رہتا ہے، ان ہستیوں کی بدولت جن کی اپنی اپنی ایک الگ دنیا ہے، ان الگ الگ دنیاؤں میں ہمیں کچھ ایسی بات نظر آتی ہے جو دوسری دنیا میں نہیں ملتی۔ لیکن ان سب چھوٹی چھوٹی دنیاؤں کے انفرادی جلوے میں ہر جگہ اس اجتماعی جلوے کا رنگ شامل ہے، جو دلّی کی سرزمین اور اس سرزمین کے ذرّے ذرّے میں موجود ہے۔ اسی رنگ نے دلّی کو دلّی بنایا اور ہر سرزمین سے الگ اس کا اپنا مزاج دیا ہے۔ معاشرت اور تہذیب کے مورخ کو دہلویت کا جلوہ دیکھنا ہو تو وہ ان ذرّوں کے دل میں جھانکتا ہے اور ان چھوٹی چھوٹی انفرادی دنیاؤں سے قرب اور تعارف حاصل کرتا ہے جو دہلی کی معاشرتی اور تہذیبی قدروں کی نشانیاں ہیں —— یہی انفرادی دُنیائیں ہیں جن سے متعارف ہونے کا شرف، اب سے کوئی ربع صدی پہلے ہمیں اس طرح حاصل ہوا تھا کہ ایک دلّی والے نے

"دلی کی چند عجیب ہستیاں" کے نام سے ایک کتاب مرتب کی تھی۔

اشرف صبوحی صاحب کی کتاب "دلی کی چند عجیب ہستیاں" اس اعتبار سے ایک عجیب اور انوکھی تصنیف تھی کہ اس میں دلی کی چند ایسی شخصیتوں کے خاکے پیش کئے گئے تھے جو دہلی کے مخصوص معاشرتی اور تہذیبی مزاج کے چلتے پھرتے نقش تھے، ایسے نقش جن کے مٹتے اور مدہم پڑتے ہوئے رنگوں میں بھی اس دلی کا عکس تھا، جس کی آب و تاب کو نہ مرہٹوں اور جاٹوں کی یورشیں مٹا سکیں نہ احمد شاہ ابدالی اور نادر شاہ کے حملے۔

اب 'دلی کی چند عجیب ہستیاں' کے مؤلف نے اپنی یادوں کے نگار خانے سے چند اور نقش باہر نکالے اور ان نقوش کی مدد سے ایک تازہ مرقع ترتیب دیا ہے۔ اس تازہ مرقعے کو اس نے 'غبارِ کارواں' کا نام دیا ہے اور ایک مرتبہ پھر تہذیبی قدروں کے اس شیدائی کے لئے سرور و انبساط کا سرمایہ مہیا کیا ہے جو 'دلی' کو ہمیشہ زندہ دیکھنے کا آرزومند ہے، اس تازہ مرقعے میں جتنے نقش، اپنے مخصوص خط و خال کے ساتھ ابھر کر ہمارے سامنے آتے ہیں وہ اس لحاظ سے تو عجیب ہیں کہ ان میں سے ہر ایک میں کوئی ایسی بات ہے جو دوسرے نقش میں نہیں لیکن اعتبار سے ان سب کا دم غنیمت ہے کہ ان کے ذکر کے ساتھ، بظاہر مٹ چکنے والی دلی، ایک مرتبہ پھر زندہ ہو جاتی ہے۔

اس نگار خانے کے ایک ایک نقش کو اس کے جداگانہ پیکر میں دیکھئے تو اس دلی کا جلوہ سامنے آئے گا جو مختلف طبقوں میں منقسم ہے اور ان جدا جدا پیکروں کو ملا کر ان پر نظر ڈالئے تو وہ دلی زندہ و تابندہ سامنے آ کھڑی ہوگی جو بہت سے پیکروں سے مل کر بنی ہے اور جس کی شان ہر زمانے میں ایک سی رہی ہے۔ اسی دہلی کے گوناگوں نقش کو ترتیب دے کر آنے والا مورخ اپنی تاریخ کے بے جان، بے روح اور بے رنگ صفحوں میں تاثیر کا رنگ

بھرے گا۔ لیکن اس کام کو بحسن وجوہ انجام دینے کے لیئے دیکھنے والے کی نظر میں وہ گہرائی اور گیرائی ہونی چاہئے کہ وہ ظاہر کے آئینے میں باطن کا عکس دیکھ سکے اور اس کے قلم میں وہ قوت و توانائی کہ وہ ماضی کے بے جان پیکروں میں زندگی کی روح پھونک سکے۔" دلّی کی چند عجیب ہستیاں" اور پھر " غبارِ کارواں " کے مؤلف و مرتب اشرف صبوحی صاحب کو اللہ نے وہی نظر دی ہے جو ظاہر کے آئینے میں باطن کا عکس دیکھتی ہے اور ان کے ہاتھ میں وہ قلم ہے جس کی قوت و توانائی سے ماضی کے بے جان پیکروں میں جان پڑتی ہے۔ ان کی اپنی ذات 'دہلویت' کے پسندیدہ عناصر کا مجموعہ ہے اور اس لیئے صرف انہیں اس بات کا حق پہنچتا ہے کہ دہلی کے متعلق اور اس کی ان ہستیوں کے متعلق کچھ لکھیں جن کی شخصیتیں دہلویت کے جیتے جاگتے مرقعے اور اس کے تہذیبی مزاج کے سانچے میں دلّی کے روزمرہ، اور اس کے اس محاورے کے ترجمان تھے دلّی کے تہذیبی پیکر اور تہذیبی مزاج کا لازمہ سمجھنا چاہئے، اب ایک ایک کرکے اللہ کو پیارے ہوتے جارہے ہیں، اس کی پاسبانی اور نگہداری اب صبوحی صاحب جیسے لوگوں کے ہاتھوں میں ہے۔ صبوحی صاحب اپنی اس ذمہ داری کا شدید احساس رکھتے ہیں اور یہی احساس لفظوں کے سانچے میں ڈھل کر غبارِ کارواں کی صورت میں نمودار اور جلوہ آرا ہوا ہے۔ غبارِ کارواں کو ہم نے دہلی کے تہذیبی مزاج کا مرقع کہا ہے۔ دہلی اور اس دہلویت کو سدا زندہ دیکھنے کے آرزومندوں کو صبوحی صاحب کا احسان مند ہونا چاہئے کہ انھوں نے مختلف النوع کرداروں کا یہ مرقع ترتیب دے کر ان کی یہ آرزو پوری کی ہے۔

ﻼ

صاحبِ عالم

بچپن میں مجھ کو کہانیاں سننے کا بہت شوق تھا جب تک کوئی کہانی نہ کہتا مجھے نیند نہ آتی۔ ایک دن مجھے بخار ہو گیا دوپہر سے جو چڑھا رات ہو گئی اماں جان میرے سرہانے بیٹھی سر دبا رہی تھیں نانی مغلانی جن کا گھر ہماری دیوار سے لگا ہوا تھا اتنے میں میری خبر سن کر آگئیں اور میرے تلوے سہلانے لگیں۔

نانی مغلانی کی عمر اس وقت اسّی کے قریب ہو گی۔ بڑی طرحدار اور محبت کرنے والی۔ مجھ پر تو ان کی جان جاتی تھی آج تک مجھے اُن کی صورت، اُن کی محبت اور اُن کی باتیں یاد ہیں۔ صورت ایسی تھی جیسے جنت کی حوروں کی سنتے ہیں اور باتوں کی لذت اللہ بخشے یہ معلوم ہوتا تھا کہ شہد کے گھونٹ کانوں سے ہو کر دل میں اتر رہے ہیں۔

میں بخار میں کراہ رہا تھا اور وہ دونوں اس کوشش میں تھیں کہ کسی طرح مجھے نیند آجائے سر دبانے اور تلوے سہلانے سے جب میری آنکھ نہ لگی تو اماں جان نے کہا "میاں، سوتے کیوں نہیں آنکھیں بند کر کے نیند کو بلاؤ تو۔ کہو تو نانی مغلانی تمہیں کوئی کہانی سنائیں؟" میں جلدی سے بولا "ہاں نانی سناؤ" نانی مغلانی سنبھل کر بیٹھ گئیں اور کہنے لگیں۔

"بھئی پرستان کا قصہ نہیں اسی دلّی کا واقعہ ہے جب قلعہ آباد تھا اور بہادر شاہ تخت پر اگلی باتیں تو کہاں رہی تھیں کہ شہزادوں سلاطین زادوں کو تیر اندازی تلواریں چلانی سکھائی جاتیں، ان کے کھیل تو یہ رہ گئے تھے کہ گھر میں اٹکن بٹکن کھیل رہے ہیں پچیسی ہو رہی ہے یا باہر نکلے تو

مُرغ بازی پتنگ بازی ہونے لگی بعض لاڈلے اور محل کے میت تو ایسے تھے کہ سترہ سترہ اٹھارہ اٹھارہ برس کی عمر ہو جاتی تھی مگر انا منہ دُھلاتی۔ کِھلائی نوالے بنا بنا کر منہ میں دیتی۔ شہر میں کسی میلے ٹھیلے کو دیکھتے کسی امیر وزیر سلاطین زادے کے ہاں شادی بیاہ کی شرکت کو جاتے تو کئی کئی بوڑھے مرد ساتھ ہیں اللہ آمین ہوتی جاتی تھی۔

ان ہی سلاطین زادوں میں ایک مرزا شبّو بھی تھے نام تو میں نہیں بتاؤں گی خدا ان کی روح کو نہ شرمائے بس مرزا شبّو ہی سمجھ لو بڑے دیدارو مگر ایسے بھولے کہ انیس برس کی عمر میں شرم کا یہ حال تھا کہ محل کی ساری لڑکیاں ان سے مذاق کرتیں اور وہ آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھتے۔ اس شرم اور بھولے پن پر اللہ رکھے عاشق مزاج ایسے کہ آج کسی کی ہنسی پر فریفتہ ہو گئے تو کل کسی کے رونے پر لوٹ پوٹ اٹواٹی کھٹواٹی لیے پڑے ہیں۔ جب تک کوئی ویسی ہنسی نہ ہنستا یا ویسا رونا نہ روتا نہ دانہ کھاتے نہ پانی پیتے اور ان کی یہ باتیں اٹھانے والے اٹھاتے اس لیے کہ بادشاہ کے قریبی رشتہ دار اور ماں باپ کے لاڈلے تھے۔

خدا کا کرنا ایسا ہوتا ہے کہ شہر میں ایک بڑی دھوم کی شادی ہوئی قلعے کی ساری شہزادیاں اور شہر کے امیروں کی بیویاں، بہو، بیٹیاں اس میں شریک ہونے کو آئیں دولہا مرزا شبّو کا لنگوٹیا یار تھا لہذا وہ دولھا کے ساتھ ہاتھی پر تھے، دلہن کی ڈیوڑھی پر برات آ کر رکی۔ بیگمات کی سواریاں اُتر رہی ہیں۔ دولھا ہاتھی پر سے اُترے تو مرزا شبّو بھی نیچے آئے اتنے میں ایک پالکی کے کہاروں کا پاؤں رپٹا پالکی کندھوں سے اُتر گئی اور پالکی کا پردہ کھل کر سواری کے کارچوبی ڈوپٹے کا پلا نیچے لٹک گیا اور ساتھ ہی ایک مہندی لگا گورا گورا پاؤں نظر آیا مرزا شبّو نے ایک کہی نہ دو خنجر کمر سے کھینچ لٹکتا ہوا پلا کاٹ لیا کہ غیروں کی نظر نہ پڑے انھیں پڑے کا بڑا خیال تھا پلا تو کاٹنے کو انھوں نے کاٹ لیا مگر پلے والی کے پاؤں پر عاشق ہو گئے

اور یہ کیفیت ہوئی جیسے تیر لگا ہوا کبوتر۔ تڑپنے لگے ساتھ والے بہ مشکل گھر لائے گھر آتے ہی منہ لپیٹ کر پڑ گئے محلات کی لونڈیاں، باندیاں، نوکریں چاکریں پھاپھا کٹنیاں ہوتی ہیں، مرزا کو جو اس حال میں آتے اور آتے ہی منہ لپیٹ کر پڑ جاتے دیکھا تو لگیں اِدھر اُدھر دوڑنے زنانے میں جا کر کچھ اِس طرح کہا کہ بیگمات سہم گئیں۔ کوئی کہتی کسی جوانا مرگ کی نظر لگ گئی ہزار بار کہا ہے کہ اِس طرح بن سنور کر نہ جایا کرو اُوپر والیاں چیلوں کی طرح منڈلایا کرتی ہیں۔ کوئی بُرے وقت کو کوستی پیٹتی، کسی نے سجدے میں پڑ کر دعائیں مانگنی شروع کر دیں، کسی نے صدقے کی چیزیں منگائیں زنانے سے مردانے تک عورتوں مردوں کا تانتا لگ گیا جھاڑ پھونکیاں ہو رہی ہیں ملّا سیانے بلائے جا رہے ہیں، پوچھا جا رہا ہے صاحب عالم منہ سے تو بولیں، بتاؤ تو کیا ہُوا۔ تم تو تلوار باندھ کر گئے تھے پھر بُری نظر کا وار کس طرح ہو گیا لیکن صاحب عالم جو پڑے ہیں تو منہ سے بولنا، سر سے کھیلنا کیا کروٹ تک نہیں لیتے۔

قلعے کی سرکاروں میں ایسے ویسے چپڑ قناتیوں کا گزر تو تھا نہیں، کیسی ہی چھوٹی ڈیوڑھی سہی جب کسی کو نوکر رکھتے تو اُس کی سات پیڑھیوں کی تحقیقات کر لیتے پھر شہزادوں اور سلاطین زادوں کے ساتھ رہنے والوں اور مصاحبوں کے لئے تو ایسی چھان بین ہوتی جیسے بیٹا بیٹی کا بیاہ ہو رہا ہے۔ اصلیوں نجیبوں کے لڑکے تلاش کئے جاتے جو صورت شکل کے بھی اچھے ہوتے کوئی نی بھی اُن کے اندر نہ ہوتی اور وقت پڑنے پر اپنے آقا کے پسینے کی جگہ خون بہانا اپنی اصالت اور شرافت سمجھتے۔

اچھا تو یہ صاحبِ عالم جن کا قصّہ ہے ان کی صحبت میں بھی کئی نوجوان تھے یوں تو ہر ایک کو اپنی اپنی جگہ اور اپنے اپنے تعلّق سے آقا کی اس حالت کا افسوس تھا کہ اُن کے ہنسی مذاق اور چیزندم خورندم پر اوس پڑ گئی تھی لیکن حقیقی صدمہ ایک بانکے مرزا کو تھا، یہ

جلے پاؤں کی بلی کی طرح تڑپتے پھرتے پہروں صاحب عالم کے سرہانے بیٹھے رویا کرتے۔

چوتھا دن تھا کہ دوپہر کے وقت صاحبِ عالم نے ہائے اللہ کرکے دوشالہ منہ پر سے ہٹایا اور آنکھ کھول کر بانکے مرزا کی طرف دیکھا اس وقت اتفاق سے یہی دونوں تھے۔

صاحب عالم : کون ؟ بانکے مرزا ؟

بانکے مرزا : جی ہاں غلام ہے

صاحب عالم : ارے بھئی جاؤ اپنے گھر میرے ساتھ کیوں مر رہے ہو ۔

بانکے مرزا : صاحب عالم یہاں سے تو میری لاش جائے گی اور آپ دیکھ لیں گے

صاحب عالم : کیوں بھئی ؟

بانکے مرزا : صاحب عالم ایسی زندگی پر تُف ہے کہ جس کی ہم خدمت کریں وہ ہمیں اپنا دکھ درد کہنے کے قابل بھی نہ سمجھے۔

صاحب عالم : اور جو بات بتانے کی نہ ہو۔

بانکے مرزا : اسی لئے تو عرض کرتا ہوں آپ نے مجھے ذلیل سمجھا بہت اچھا نہ بتائیں

یہ کہہ کر بانکے مرزا نے خنجر کمر سے کھینچ اپنی چھاتی پر رکھا اور چاہتے ہی تھے کہ اپنے دل کو چھید ڈالیں صاحبِ عالم نے جھپٹ کر ہاتھ پکڑ لیا۔ بڑی ضد بحث کے بعد صاحب عالم نے مرزا بانکے کے ہاتھ سے خنجر لیا اور اپنے پاس بٹھا کر ساری داستان سنائی کہ اس طرح میں فلاں کی شادی میں گیا تھا وہاں ایک پالکی اُتر رہی تھی یوں پالکی کے کہار رپٹے یوں پالکی کا پردہ کھل گیا اور اس طرح پالکی میں بیٹھنے والی کے دوپٹے کا پلّا لٹک پڑا یہ خیال کرکے میں نے وہ پلّا کاٹ لیا کہ پردہ فاش نہ ہو اس میں سواری کے پاؤں کا تلوا نظر آیا جسے دیکھتے ہی میری بُری حالت ہو گئی نہ بھوک ہے نہ پیاس زندگی اجیرن معلوم ہوتی ہے اگر وہ اور دو چار

دن میرے پہلو میں نہ آگئی تو ارادہ ہے کہ کچھ کھا کر سو رہوں یا اپنا گلا کاٹ لوں۔

بانکے مرزا : بس!

صاحب عالم : (ٹھنڈا سانس لے کر) بس اور تمہیں معلوم ہے کہ میں اپنی دھن کا کیسا پکا ہوں

بانکے مرزا : اچھا تو آپ اب کھڑے ہو جائیے کھائیے پیجئے ہنسئے بولیئے ذرا فکر نہ کیجئے اس پالکی والی کا پتہ لگانا اور اسے آپ کے پہلو میں لا بٹھانا بانکے مرزا کا کام ہے

صاحب عالم : (خوش ہو کر) تم اس کا پتہ لگا لوگے

بانکے مرزا : پتہ نہیں لگاؤں گا تو منہ نہیں دکھاؤں گا دوپٹے کا وہ پلّو جو آپ نے کاٹا ہے مجھے عنایت کر دیجئے

صاحب عالم : (پلّو اپنے سرہانے سے نکال کر دیتے ہیں) کب تک؟

بانکے مرزا : کم سے کم پندرہ دن اور زیادہ سے زیادہ ایک مہینہ۔ میری شرافت پر بھروسہ کیجئے لیجئے اب میں رخصت ہوتا ہوں

بانکے مرزا نے رفاقت کے جوش اور شرافت کے تقاضے سے وعدہ تو کر لیا مگر جب قلعہ سے باہر نکلے تو سوچ میں پڑ گئے کہ یہ کیا حماقت کی شادی تھی ہزاروں عورتیں آئی ہوں گی پھر فقط دوپٹے کے ایک پلّو سے کس طرح پتہ لگ سکتا ہے کہ کون تھا لیکن اب تو وعدہ کر آئے تھے قولِ مرداں جاں دارد' بڑا فکر ہوا چاروں طرف خیال دوڑایا۔ شادی والے دن اتفاق کی بات یہ آگرے گئے ہوئے تھے سواریاں بھی آتے جاتے نہیں دیکھی تھیں۔

سوچتے سوچتے شہر کی کٹنیاں یاد آگئیں جو سب سے زیادہ چالاک تھیں انہیں گھر میں قصہ سنایا اور کھوج لگانے کے لئے مقرر کیا۔ کٹنیوں نے بھی انعام کے لالچ میں ایک ایک

کوچہ چھان مارا مگر کوئی کھوج نہ لگا، بھلا شریف زادیوں میں کون اپنا گھٹنا کھولتی اور لاجوں مرتی، آخر وعدے کے دن پورے ہونے کو آئے اور کوئی صورت نہ نکلی، بانکے مرزا نے دل میں ٹھان لی کہ اب اس سے پہلے کہ صاحب عالم کو منہ دکھاؤں مر جانا بہتر ہے دل میں یہ ٹھان کر سنکھیا لائے اور اس کی پڑیا اپنے سرہانے رکھ لی کہ رات کو کھا کر سو جاؤں گا۔

تھے ایسے مرد کہ اپنی بیوی سے بھی کچھ نہیں کہا مہینہ بھر میں کسی نے نہیں جانا کہ بانکے مرزا کس مصیبت میں گرفتار ہیں، اب یہ تماشا سنو جس دن بانکے مرزا نے سنکھیا لا کر رکھی ہے اسی روز اتفاق سے ان کی بیوی نے دھوپ دینے کو اپنے کپڑے نکالے اچانک ایک دوپٹے پر مرزا کی نظر پڑی۔ غور سے دیکھا تو اس کا پلّا کٹا ہوا دکھائی دیا۔ اچھل پڑے جلدی سے صاحبِ عالم کا دیا ہوا پلّو کا ٹکڑا نکالا دوپٹے سے جا کر ملایا تو ٹھیک تھا

بیوی: آپ کیا دیکھ رہے ہیں؟

مرزا: ذرا کوٹھڑی کے اندر چلو تو بتاؤں

بیوی میاں کے تیور دیکھ کر ڈر گئی مرزا نے ایک ہاتھ میں ننگی تلوار لی اور دوسرے ہاتھ سے بیوی کا بازو پکڑا اور اندر لے گئے

بانکے مرزا: یہ کس کا دوپٹّہ ہے

بیوی: (سہمی ہوئی آواز سے) میرا۔ آپ ہی نے بنوا کر دیا تھا یاد کر لیجئے

بانکے مرزا: یاد ہے مگر اس کا پلّو کٹا کس طرح سچ سچ بتا دو ورنہ خیر نہیں۔

پارسا بیوی پہلے تو بہت گھبرائی لیکن چونکہ خطا کار نہ تھی اس لئے اس نے حرف بہ حرف سارا واقعہ سُنا دیا اور مرزا کے قدموں پر سر جھکا کر بولی "لونڈی کا اتنا قصور ضرور ہے کہ آپ سے کہا نہیں اب آپ کو اختیار ہے۔ اتنا سُن کر بانکے مرزا پر ایک سکتے کا سا عالم طاری ہو گیا تلوار

ہاتھ سے چھوٹ گئی اور کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔

بڑی دیر تک مرزا کچھ سوچتے رہے پھر ایک دفعہ ہی جیسے سوتے سے آدمی جاگتا ہے پیچھے ہٹ کر بولے "بگیم میں زبان دے آیا ہوں"۔

بیوی : (سر اُٹھا کر حیران ہوتے ہوئے) کیا زبان دے آئے اور کسے ؟

مرزا : یہ نہ پوچھو اور جو میں کہوں کرو

بیوی : مجھے آپ کے حکم سے کب انکار ہے

مرزا : تو یہی جوڑا جس کے دوپٹہ کا پلا کٹا ہوا ہے پہن لو۔ بناؤ سنگھار بھی اس دن جیسا کر لو میں ابھی پینس لاتا ہوں اس میں بیٹھ کر جہاں میں لے جاؤں چلو۔

بیوی میاں کا منہ دیکھنے لگی کچھ بولنے کی جرات نہ تھی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے یہ دیکھ کر مرزا نے بڑی ہمّت سے کہا دیکھو بگیم آج تک تم میری بیوی تھیں اور میں تمہارا میاں لیکن آج میں یہ رشتہ توڑتا ہوں۔

بیوی اتنا سنتے ہی سفید پڑ گئی اور بدن تھر تھرانے لگا بڑی مشکل سے اپنے آپ کو سنبھال کر گلوگیر آواز میں کہنے لگی اچھا اتنا تو بتا دو کہ تم مجھ سے خفا تو نہیں مرزا بولے بگیم اس وقت ایسی باتیں نہ کرو میرے ارادے میں ذرا سا فرق آیا تو سارے خاندان کی ناک کٹ جائے گی میرا لاشہ تمہیں تڑپتا ہوا نظر آئے گا۔

یہ کہتے ہوئے مرزا باہر چلے گئے پالکی لاکر دروازے پر لگا دی بیوی ہانپتی کانپتی پالکی میں سوار ہوئی آگے آگے مرزا تھے اور پیچھے پیچھے پالکی قلعہ میں داخل ہوئے اور صاحب عالم کے دیوان خانے پر جا پہنچے۔

دروازے میں پالکی رکھوائی آپ اندر گئے صاحب عالم مسہری پر لیٹے ہوئے تھے مرزا

کو دیکھتے اُٹھ بیٹھے اور بولے "کہو مرزا ہمارا کام بنا تمہارے وعدے میں صرف آج اور کل کا دن باقی ہے۔"

مرزا : آپ نے مرزا کو سمجھا کیا ہے صاحب عالم ابھی ہمارے خون میں اصالت کے جوہر موجود ہیں آپ کی مراد لے کر آیا ہوں۔

صاحبِ عالم : (بیتاب ہو کر) کہاں کہاں ؟

مرزا : ڈیوڑھی میں پینس رکھی ہے

صاحبِ عالم تھے تو نرے صاحبِ عالم اور عاشق مزاج بھی لیکن ابھی تک اپنے بڑوں کی عزت کا پاس تھا، رعایا کی بہو بیٹیوں پر بُری نظر ڈالنے کی عادت نہ تھی کچھ سہم سے گئے اور متوحش آنکھوں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔

مرزا : آپ گھبرا کیوں گئے ؟

صاحب عالم : بڑے حضرت کا ڈر ہے

مرزا : اس کا میں نے بندوبست کر لیا ہے

صاحب عالم : تو پھر اندر لے آؤ

مرزا : لیکن یہ سمجھ لیجئے کہ میں نے اپنی جان پر کھیل کر یہ کام کیا ہے چار گھنٹے کے وعدے پر لایا ہوں شوہر والی ہیں کوئی رانڈ بیوہ یا بازاری عورت نہیں۔

صاحب عالم : اچھا انہیں اندر بھیج دو لیکن تم کہیں چلے نہ جانا

مرزا بہت خوب کہہ کر ڈیوڑھی میں پالکی کے پاس آئے اور بیوی کو آواز دی۔ بیوی پریشان میاں کی اس حرکت سے سہمی ہوئی اپنے خیالات میں محو ایک طرف خاموش بیٹھی تھی میاں کی آواز جو سُنی تو چونک پڑی اور بھرّائی ہوئی آواز میں بولی فرمائیے۔ مرزا نے کہا یہ

میرے ولی نعمت کا مردانہ مکان ہے اندر صاحبِ عالم تشریف رکھتے ہیں اتر کر ان کی خدمت میں جاؤ اُن کا دل بہلاؤ میں تمہیں طلاق دیتا ہوں ۔۔۔۔

یہ کہتے کہتے مرزا کی آواز بھرا گئی مگر وہ بات کے دھنی تھے بولے میں منہ پھیرے لیتا ہوں اترو اور اندر جاؤ سامنے والے کمرے میں صاحبِ عالم تشریف فرما ہیں ۔

بیوی کانپتی ڈرتی پالکی سے اتری اور لڑکھڑاتی ہوئی اندر گئی منہ دوپٹے سے چھپا ہوا تھا اور آنکھوں سے لڑیاں جاری تھیں کمرے میں پہنچ کر صاحبِ عالم کے سامنے جا کھڑی ہوئی

صاحبِ عالم نے آنکھ اُٹھا کر دیکھا اور نظر نیچی کر لی، جوانی بھی ٹھہرا دیے تھے اس پر عشق لیکن ہمت نہیں پڑتی تھی کہ ہاتھ بڑھائیں، آنے والی کی سسکیوں کے ساتھ رونے کی آواز برابر کانوں میں چلی آ رہی تھی ۔

صاحب عالم : (نیچے آنکھیں کئے کئے) نیک بخت تم تو رو رہی ہو میں تم سے کچھ کہتا تو نہیں صرف اتنا بتا دو کہ تمہارے میاں کون ہیں ۔

عورت : (بڑی مشکل سے) بانکے ۔۔۔۔۔۔ مرزا ۔۔۔۔۔۔

صاحب عالم : (حیرت سے) تم بانکے مرزا کی بیوی ہو تمہارا ہی دوپٹہ زمین پر لٹک گیا تھا ؟

عورت : (روتے ہوتے) جی ہاں یہ دیکھئے

صاحب عالم : (گھبرا کر) غضب غضب لاحول ولاقوۃ اور وہ ننگے پاؤں ننگے سر ڈیوڑھی کی طرف چلے عورت سہم کر اوندھے منہ سجدے میں گر پڑی ۔

بانکے مرزا ڈیوڑھی میں آنکھیں بند کئے مونڈھے پر سر جھکائے بیٹھے تھے صاحبِ عالم نے آتے ہی کہا "اماں مرزا تم یہ کس کو لے آئے ان پر تو کوئی جن عاشق معلوم ہوتا

ہے جونہی میں نے انھیں ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھانا چاہا تابدان میں سے ایک نہایت بدہیبت ہاتھ نکلا اور آواز آئی کہ خبردار یہ ہماری منکوحہ ہے ہاتھ لگایا تو ابھی گلا گھونٹ دوں گا۔ اس لئے انھیں تو یہاں سے لے ہی جاؤ۔

مرزا نے کہا صاحبِ عالم یہ تو آپ نے میری ساری محنت ہی اکارت کر دی حضت وہم نہ کیجئے جاتیے اب کے اگر ہاتھ دکھائی دے تو مجھے بلا لیجئے گا میرے سامنے اگر ہاتھ نکلا تو جن کو بھی ٹنڈا سمجھ لیجئے۔

مرزا کی رفاقت اور محنت کا نقش صاحب عالم کے دل میں اور بھی گہرا بیٹھتا جاتا تھا۔ آخر تیموری خون میں جوش آگیا غیرت آئی سوچا کہ مرزا نے میرے نمک کا پاس کر کے اپنی بیوی کو مجھ تک پہنچا دیا اب مجھے بھی اپنی شرافت دکھانی چاہئے مرزا کو اپنے آگے لے کر کہا اچھا مرزا دیکھوں تم کتنے بہادر ہو جاؤ اور انھیں ہاتھ لگاؤ اس جن سے مقابلہ کرواتنے میں ذرا محل ہو آؤں۔

یہ کہتے ہوئے صاحبِ عالم تو زنانی ڈیوڑھی کی طرف چلے اور مرزا ننگی تلوار ہاتھ میں لے کر کمرے کے اندر پہنچے بیوی کو دیکھا تو سر بہ سجدہ ہے آواز دی کچھ جواب نہ ملا آنکھیں تابدان کی طرف لگی ہوتی تھیں چھپر کھٹ کے قریب جا کر کھڑے ہوتے تھے کہ یکایک تابدان کے اندر سے ایک سیاہ بھجنگ کالا ہاتھ نکلا اور آواز آئی خبردار جو اس عورت کو کسی نے ہاتھ لگایا اسے فوراً اپنے گھر پہنچا دو۔

مرزا پہلے تو جھجکے پھر سنبھل کر ڈرتے ڈرتے آگے بڑھے اور اللہ کا نام لے کر نکلے ہوئے ہاتھ پر تلوار مار دی اور آنکھیں بند کر لیں ادھر تو ہاتھ چھپر کھٹ کے اوپر گرا اور ادھر تابدان کی پشت پر کسی کے گرنے کا دھماکہ ہوا نوکر چاکر آواز سن کر دوڑے دیکھا تو صاحب عالم خون میں لت پت بے ہوش پڑے ہیں شور مچ گیا کہ صاحبِ عالم کے دشمنوں کا کسی نے خون کر دیا مرزا

کے کانوں میں جو یہ آوازیں پہنچیں تو وہ کٹے ہوتے ہاتھ کو دیکھتے دیکھتے باہر پہنچے اور ہائے صاحبِ عالم میرے آقا کہہ کر صاحب عالم کے پاس گر پڑے اور پھر سنبھل کر اُٹھے بیوی کو تو سوار کرا کے گھر روانہ کیا اور صاحبِ عالم کو اٹھوا کر کمرے میں لاتے جراحوں کو چپ چپاتے بلوایا مرہم پٹی کروائی ہوش میں لانے کی تدبیریں کیں۔

خدا خدا کرکے کوئی مہینہ بھر کے بعد زخم مندمل ہونا شروع ہوا اور صاحبِ عالم اپنے سہارے اُٹھنے بیٹھنے اور بات چیت کرنے لگے، اب ایک دن رات کے بارہ بجے موقع پاکر مرزا نے ذرا کڑے تیوروں سے صاحبِ عالم سے کہا قبلہ یہ آپ کو کیا سوجھی تھی میرے ہی نامۂ اعمال کو سیاہ کرنا تھا صاحبِ عالم نے جواب دیا "سنو مرزا جب تم سر ہوتے تو میں نے اپنا حالِ زار تم کو سُنا دیا اور تم اس کا کھوج لگا کر میرے پاس لے بھی آتے لیکن جب اس نے بڑی مشکل سے بتایا کہ میں بانکے مرزا کی بیوی ہوں تو تمہارا نام سنتے ہی مجھے اتنی غیرت آئی کہ اگر خودکشی گناہ نہ ہوتی تو اسی وقت اپنا خاتمہ کرلیتا۔ ہے ہے مرزا ایک معمولی سا آدمی تو نمک کی اتنی پاسداری کرے اور میں بادشاہوں کی اولاد کہلا کر اپنی رعایا کے حق میں بھیڑیا نکلوں اس وقت مجھے یہی سوجھا کہ جس ہاتھ سے اس پاکدامن کے پلّو کو چھوا تھا وہ ہاتھ اسی شخص کی تلوار کاٹے جس کا میں گنہگار ہوں چنانچہ یہ ڈھونگ بنایا اور ترکیب کارگر نکلی، مرزا نے جماہی لیتے ہوئے کہا۔ بہرحال آپ نے اچھا نہیں کیا میری آنکھیں آپ کو اس حال میں نہیں دیکھ سکتیں خیر اب آپ آرام فرمایئے باقی باتیں صبح ہوں گی۔

صبح کو نوکر چاکر اُٹھ کر صاحب عالم کے کمرے کی طرف آنے لگے تو مرزا کے بچھونے پر خون کے چکتے دیکھے چادر جو ہٹائی تو چھاتی میں خنجر گھسا ہوا تھا اور مرزا مردہ۔

یہاں تک کہانی کہنے کے بعد مُغلانی نانی چپ ہوگئیں۔

والدہ: اور اس بے چاری بیوی پر کیا گزری۔

مغلانی: خدا نے جیسی ڈالی صبر شکر کیا اس زمانے کی عورتیں ایسی تو تھیں نہیں کہ ہلتے داویلا مچا کر محلّے کو سر پر اٹھالیں دوسرے بانکے مرزا اتنا چھوڑ گئے تھے کہ بیوی کی ساری زندگی کو بہت تھا کونے میں بیٹھ کر آبرو کے ساتھ گزار دی۔

والدہ: کاش میں انھیں دیکھتی

مغلانی نانی نے ایک ٹھنڈا سانس لیا اور بولیں۔ لو بُوا دیکھ لو وہ جنم جلی بانکے مرزا کی بیوہ یہی ہے۔

والدہ حیرت سے اُن کا منہ تکنے لگیں میں بھی اُٹھ کر بیٹھ گیا اور گھر میں ایک سناٹا چھا گیا۔

موٹے آکا

غدر کے بعد میر پنجے باز کی ہستی تو مانی ہوئی ہستی تھی۔ مرزا ولی اللہ بیگ ابھی مرے ہیں جن کو دعویٰ تھا کہ سو جوان ایک طرف کھڑے ہو جائیں اور وار کریں میں سب کی چوٹیں بچاتا اور اپنی چوٹ کرتا نکل جاؤں گا۔ مگر چھپے رستموں میں ایک آکا مصطفیٰ بیگ کا دم باقی رہ گیا تھا جنہیں لوگ عام طور پر موٹے آکا کہا کرتے تھے۔

چاوڑی بازار میں شاہ بولا کے بڑ سے قاضی کے حوض کی طرف چوڑی والوں کے محلے کے برابر حافظ داؤد کا کمرہ ہے۔ اس کمرے کے نیچے اب تک ایک دکان رفوگری کی ہے۔ اس زمانے میں یہاں مرزا یار رنجان ایک کشمیری ناٹا سا قد، ہاتھ پاؤں بھرے بھرے۔ ڈنٹر پھلائے بیٹھے رفو کیا کرتے تھے۔ آکا مصطفیٰ بیگ اپنے آخری دنوں میں اسی کمرے پر آرہے تھے اور اس لیے عصر کے بعد عموماً مرزا یار رنجان کی دکان کے آگے مونڈھے پر ان کی بیٹھک تھی۔ ایسے ڈیل ڈول اور کلے جبڑے کے آدمی اب دیکھنے میں نہیں آتے۔ مغل بچوں کا پورا نمونہ تھے۔ بڑھاپے میں چہرے سے خون ٹپکتا تھا۔ آواز ایسی کراری کہ بولتے تو یہ معلوم ہوتا شیر گرج رہا ہے۔ جسم کی کھال تو البتہ لٹک گئی تھی۔ لیکن ڈنٹروں کی مچھلیاں اب بھی ایسی طاقت ور تھیں کہ کیا مجال جو چٹکی تو لی جا سکے۔

کہتے ہیں کہ شاہی میں ان کے والد اپنے وقت کے بڑے بانکے تھے۔ انہوں نے بھی قلعہ میں پرورش پائی تھی۔ باپ کے مرنے کے بعد جس وقت تک ابوظفر سراج الدین

کا چراغ ٹمٹماتا رہا قلعے ہی میں رہے۔ غدر ہوا تو زخمی ہو کر قید ہوئے۔ چھوٹے تو دوجا تے جا پہنچے۔ ادھیڑ عمر میں دلی آئے اور جب تک جیئے الگنگ جیئے۔

آکا کی نسبت سنا ہے کہ بانک میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ بانک خنجر بازی کا نام ہے۔ کبھی سچ مچ کی چھریوں سے اس کی مشق ہوتی تھی۔ پھر لکڑی کی چھریاں ہوگئیں۔ اس میں بہت سے داؤں بھی ہوتے ہیں۔ مثلاً ہت کوڑا۔ بغل گیر۔ حلقوم۔ گولا لاٹھی۔ بازو بند وغیرہ۔ جس طرح بنوٹ کی چوٹیں کاری سمجھی جاتی ہیں۔ اسی طرح اس کے داؤں لڑائیوں میں اس کا استعمال کب ہوتا تھا صحیح نہیں معلوم۔ داستانوں میں عیاروں کی خنجر بازی سُنی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ جنگ مغلوبہ میں جب تلوار چلانے کی جگہ نہ رہتی ہوگی تو خنجر اور کٹار سے کام لیا جاتا ہوگا بہرحال یہ بھی ایک سپاہیانہ فن تھا اور اس کے جاننے والوں میں آکا بھی تھے۔

آکا کی شہ زوری اور بکیتی کی عام طور پر شہرت ایک اتفاقیہ واقعہ سے ہوئی۔ اُن دنوں شاہ بولا کے بڑ کا تراہا سانڈوں کا ایک اکھاڑہ تھا۔ تیسرے چوتھے روز ضرور ایک آدھ کشتی ہو جاتی۔ سیلانیوں کے ٹھٹھ لگ جاتے۔ اس میں کبھی کبھی بھاگ دوڑ میں لوگوں کے چوٹیں لگ جاتیں۔ مگر یہ بھی ایک سیر تھی۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ آکا یار نجان کی دکان کے آگے مونڈھے پر آ کر بیٹھے ہی تھے کہ شاہ بولا کے بڑ کی طرف سے ایک شور اٹھا۔ معلوم ہوا کہ کوئی بڑی جوڑ چھوٹی ہے۔ اتنے میں سانڈ ڈکراتے ہوئے قاضی کے حوض کی طرف چلے۔ لوگ اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر بھاگ رہے تھے۔ یار نجان نے آکا سے کہا اوپر آ جائیے سانڈوں کا رُخ اسی طرف ہے۔ آکا نے ہنس کر جواب دیا۔ مرزا ڈرو نہیں۔ جانوروں سے کیا بھاگنا۔ آ رہے ہیں تو آنے دو۔

سانڈوں کو اپنے زور دکھانے سے کام تھا۔ کوئی روندن میں آ جائے یا کسی کا خوانچہ

اُلٹ جائے ان کی بلا سے۔ اتنے میں سانڈوں نے دکان کے آگے آکر سینگ جوڑ لیے۔ اب پھر یارنجان نے کہا۔ "آکا دکان کے اُوپر کیوں نہیں آجاتے؟" آکا پھر ہنسنے لگے۔ "مرزا! یہاں بھی ایک سانڈ بیٹھا ہے۔ آنے تو دو"!

یارنجان کچھ اور کہنا ہی چاہتے تھے کہ سانڈ آڑے ہو کر لڑنے لگے۔ سڑک پر تازہ تازہ چھڑکاؤ ہوا تھا۔ دکان کی طرف جس سانڈ کی پشت تھی اس کا پاؤں رپٹا اور دوسرا اسے رگیدتا ہوا چلا۔ آکا کے مونڈھے کے قریب پٹری کے نیچے اس نے گھٹنے ٹیک دیے۔

آکا۔ "بس بھئی بس۔ اب اس نے گھٹنے ٹیک دیئے۔ تم بھی ہٹ جاؤ۔

لوگ ہنسنے لگے کہ آکا جانوروں سے بھی ایسی باتیں کرتے ہیں جیسے آدمیوں سے۔ بھلا سانڈ ان کی سنیں گے۔ دو چار نے آکا سے اصرار بھی کیا کہ اتنی جی داری اچھی نہیں۔ اپنا مونڈھا ہٹا لیجئے۔ مگر آکا قطب تھے۔ قطب از جا نمی جنبد کے مصداق انہوں نے جب دیکھا کہ گرے ہوئے کو دوسرا مارے جاتا ہے تو آستیں چڑھا کر بولے۔ "نہیں مانتا اب کیا میں اٹھوں"! اتنے میں بچھڑا ہوا سانڈ پٹڑی کے برابر لمبا لمبا لیٹ گیا تھا اور دوسرے نے اس کی چھاتی پر گھٹنے ٹیک دیے تھے۔ آکا نے اُٹھتے ہی پہلے تو پھنپھناتے ہوئے سانڈ کی کوکھ پر ایک لات رسید کی۔ لات کو تو وہ پی گیا بلکہ جھنجھلا کر اس نے آکا پر حملہ کرنا چاہا تو آکا نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کے دونوں سینگ پکڑ لیے اور ایک ریلے میں اس کو سڑک کے بیچ میں لے گئے۔ سانڈ نے جھرجھری لے کر سینگ چھڑانے چاہے۔ سانڈ کا جھرجھری لینا تھا کہ آکا نے گاؤ مکھ کا داؤں کیا۔ سانڈ اَرّا کر زمین پر آ پڑا۔ تماشائیوں میں حیرت چھائی ہوئی تھی۔ سانڈ کے گرتے ہی شور مچ گیا کہ واہ آکا واہ کیا بات ہے۔ سچ مچ کا گاؤ مکھ آج ہی دیکھا ہے۔

سانڈ گر پڑا تو آکا نے اس کے منہ پر تھوک دیا۔ اور بولے "اسی برتے پر آکا کا مونڈھا

اٹھوا رہا تھا۔ جا اب سیدھا چلا جا ورنہ بے چھری حلال کر دوں گا۔" سانڈ کوئی ایک منٹ تو چپ پڑا رہا۔ پھر اُٹھ کر ایسا بھاگا کہ پلٹ کر نہیں دیکھا۔

اس وقت بھی ڈپٹی کمشنر، اور کمشنر، وغیرہ کے بنگلوں پر بعض پرانی دیگ کی کھرچنیں قابوں میں لگ کر جایا کرتی تھیں۔ وہ جب حکام سے ملتے آزادی کے ساتھ اور اپنے کو لیے دئے۔ حکام بھی ان کی ایسی ہی عزت کرتے۔ برابر کی ملاقاتیں ہوتیں۔ مل کر بیٹھتے تو کام کی باتوں کے علاوہ شہر میں جو اچنبھے کی بات ہوتی اس کے متعلق رائے زنیاں کی جاتیں۔ مسلمانوں میں ڈپٹی ہادی حسن خاں شہزادہ سلیمان شاہ اور ہندوؤں میں لالہ بالا پرشاد نہر والے خصوصیت کے ساتھ اس بات کا خیال رکھتے کہ دلی والوں پر کوئی حرف نہ آئے۔

اچھا آغا مصطفیٰ بیگ کی سانڈ سے کشتی کے بعد جو ڈپٹی ہادی حسین خاں کی ڈپٹی کمشنر بہادر سے ملاقات ہوئی تو کہیں اس واقعہ کا بھی ذکر آگیا۔ صاحب نے پوچھا یہ آغا کون شخص ہے۔ ہم اس کو دیکھنا چاہتے ہیں۔" ڈپٹی صاحب نے کہا ایک با امن شہری ہے۔ لکڑی اور خاص کر بانک کے فن کا جاننے والا۔ اب ان کے سوا شاید دلی میں دوسرا نہیں۔ رہا ان کے دیکھنے کا سوال۔ شام کو بلا ناغہ چاوڑی بازار میں حافظ داؤد کے کمرے کے نیچے ان کی نشست ہوتی ہے جب جی چاہے اُدھر نکل جائیے اور دیکھ آئیے۔"

ڈپٹی کمشنر: وہ ہمارے بنگلے پر نہیں آئیں گے؟

ڈپٹی صاحب: ان آغاؤں سے آپ واقف نہیں۔ بے بلائے یہ بادشاہوں کے دربار میں تو گئے نہیں۔ اور گئے بھی تو پہلے یہ فیصلہ کر لیا کہ کہاں بٹھائے جائیں گے۔ کس طرح ان سے گفتگو کی جائے گی۔

ڈپٹی کمشنر: لیکن وہ زمانہ اور تھا۔ اُن پرانے دستوروں کے ہم پابند نہیں۔

ڈپٹی صاحب : آپ پابند نہیں وہ تو پابند ہیں۔

غرضیکہ اسی طرح کی رد و بدل کے بعد صاحب بہادر نے وعدہ کر لیا کہ ہم کرسی دیں گے اور عزت کے ساتھ ملیں گے۔ ڈپٹی صاحب نے کہا میں وعدہ تو نہیں کرتا لیکن کوشش کروں گا کہ انہیں لاکر آپ سے ملا دوں۔

آکا کی نشست اکرام اللہ خاں کے ہاں رہتی تھی۔ چنانچہ ہادی حسین خاں نے اُن کے ذریعے سے آکا کو ڈپٹی کمشنر کے بنگلے پر چلنے کے لئے مجبور کیا اور صاحب کو چٹھی لکھی کہ میں نے بڑی کوشش کے بعد آکا کو جناب کی ملاقات کے لئے رضامند کر لیا ہے۔ آپ جو دن اور وقت مقرر کریں انہیں لے کر حاضر ہوں۔ امید ہے کہ آپ ان کی واجب تعظیم فرمائیں گے صاحب نے ہادی حسین خاں کی چٹھی کا فوراً جواب دیا۔ ملاقات کا دن اور وقت مقرر کر کے وعدہ کیا کہ ملاقات چونکہ نجی ہے اس لئے دوستانہ ہوگی۔

چنانچہ جب ڈپٹی صاحب آکا کو لے کر صاحب کے بنگلے پر پہنچے اور اطلاع ہوئی تو وہ بلا تامل باہر نکل آئے۔ ڈپٹی صاحب منحنی سے آدمی تھے اور ان کے مقابلے میں آکا کے ڈیل ڈول اور چہرے پر نظر پڑی کہ ایک شیر ہے۔ ڈاڑھی چڑھی ہوئی جسم کا رنگ ململ کے باریک انگرکھے میں سے پھوٹا پڑ رہا تھا۔ حیران رہ گئے۔ آگے بڑھے۔ پہلے ڈپٹی صاحب سے ہاتھ ملایا پھر آکا سے۔ معلوم ہوا کہ فولاد کے پنجے میں ہاتھ ڈال دیا۔ صورت دیکھنے لگے۔

صاحب (آکا سے) آپ اچھے ہیں ؟

آکا : اچھا تو خدا کا نام ہے۔ زندہ ہوں

صاحب ، (ڈپٹی صاحب کی طرف دیکھ کر) کیا مطلب ؟

ڈپٹی صاحب : آکا صاحب کا مطلب ہے کہ آپ جیسے حاکم شہر میں ہوں وہاں بُرائی

کا کیا کام۔ خدا کی اس مہربانی کا شکریہ ادا کرنے کے لئے ہم زندہ ہیں۔

صاحب (آکا سے) مجھے آپ کی ملاقات کا بہت شوق تھا۔

آکا: آپ کی مہربانی۔

صاحب: آپ کے متعلق معلوم ہوا ہے کہ آپ پٹا بازی کا ہنر خوب جانتے ہیں۔

آکا: پٹا بازی کیسی میں سمجھا نہیں۔

صاحب: محرم میں تعزیوں کے سامنے لکڑیوں سے جو کھیل کھیلتے ہیں کیا آپ وہ نہیں جانتے؟

آکا: صاحب خدا خدا کیجئے۔ ایک ستر برس کے بوڑھے کو کھیل سے کیا نسبت۔

صاحب: ہم نے تو بوڑھے بوڑھوں کو اچھلتے کودتے دیکھا ہے اور ہمارے ڈپٹی صاحب کہتے تھے کہ آپ ان کے استاد ہیں۔

آکا: ہاں انہوں نے دو چار گھائیاں مجھ سے سیکھی ہیں۔

صاحب: گھائیاں کیا؟

آکا: لکڑی کے فن کے داؤں یا چوٹیں۔

صاحب: تو کیا اس میں بھی اچھلتے کودتے ہیں۔

آکا: اچھل کود تو پٹا بازی یا ہنوتی میں ہوتی ہے۔ بانک اور بنوٹ کو ان بوزنہ حرکتوں سے کیا تعلق؟

صاحب: بانک اور بنوٹ میں کیا ہاتھ پاؤں ہلانے نہیں پڑتے؟

آکا: ہلانے پڑتے ہیں۔ لیکن ضرورت کے وقت۔ بنوٹ کے تو نام ہی سے ظاہر ہے کہ اس کو کوئی اوٹ نہیں۔ اس کے داؤں سے دشمن نہیں بچ سکتا۔ بانک والا بیٹھے بیٹھے اور

لیٹے لیٹے بھی اپنا داؤں کر جاتا ہے۔ جس طرح بنوٹ کے لیے کسی ہتھیار کا ہونا لازمی نہیں۔ اس کا جاننے والا رومال کی گرہ سے بندوق کی گولی کا کام لے سکتا ہے۔ اسی طرح بانک کے اگر کسی کو دوچار داؤں بھی رواں ہیں تو مقابل کے سارے ہتھیار بے کار ہیں۔

صاحب: لیکن یہ فن اگلے زمانے میں شاید کچھ بکار آمد ہو۔ آج کل بندوق اور ریوالور کے مقابلے میں اسے سیکھنا وقت ضائع کرنا ہے۔

آغا: بندوق اور طمنچہ کے سامنے واقعی بانک اور بنوٹ کی کاریگری کچھ حقیقت نہیں رکھتی آپ کا ارشاد بجا ہے۔ مگر ایسے بھی تو بہت سے موقعے آدمی کو پیش آجاتے ہیں جہاں یہ چیزیں نہیں ہوتیں۔ فقط ہاتھ پاؤں سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔

صاحب: ولایت میں بوکسنگ اور فنسنگ ہم لوگ بھی اسی مطلب کے لیے سیکھتے تھے لیکن ریوالوروں کے مقابلے میں اب یہ چیزیں صرف کھیل سمجھی جاتی ہیں۔

آغا: بوکسنگ اور فنسنگ کیا ہوتا ہے؟

صاحب: گھونسے بازی اور شمشیر زنی۔

آغا: بہت مبارک۔ لیکن کبھی اُن کے دکھانے کا کوئی موقع بھی ملا۔

صاحب: کیا مطلب؟

آغا: میرا مطلب یہ ہے کہ جب سے آپ نے یہ فنون سیکھے ہیں آپ کو کبھی دشمنوں سے مقابلہ کرنا پڑا ہے۔ کیونکہ جب تک ایسی صورت پیش نہیں آتی کسی فن کی حقیقت نہیں کھلا کرتی۔

صاحب: مجھے تو کبھی ایسا اتفاق نہیں ہوا۔ مگر ہمارے ملک میں ایسے واقعات بہت ہوتے رہتے ہیں۔

آغا: وہ لوگ گھونسے کے مقابلے میں گھونسے اور تلوار کے مقابلے میں تلوار ہی چلاتے

ہوں گے۔

صاحب: قطعی۔

آغا: اگر کسی کو گھونسا بازی نہ آتی ہو یا تلوار اس کے پاس نہ ہو اور دشمنوں میں گھر جائے؟

صاحب: تو اس کی موت ہے۔ دشمن اس پر غلبہ پالیں گے۔

آغا: لیکن ہمارا فن ہتھیاروں کے بغیر بھی اپنے جاننے والے کی جان بچا سکتا ہے۔

صاحب: کیا آپ کو تلوار کے مقابلے میں تلوار اور گھونسے کے جواب میں گھونسے کی ضرورت نہیں۔

آغا: بالکل نہیں۔ بلکہ ایک دفعہ تو بندوق اور طمنچہ کی زد سے بھی بچ سکتے ہیں۔

صاحب: میں نہیں سمجھ سکتا۔

آغا: سانڈ کے مقابلے میں میرے پاس کیا ہتھیار تھا؟

صاحب: مگر سانڈ تو جانور ہے۔

آغا: آپ کا تگے باز ایسے موقع پر کیا کرتا۔ سانڈ کی جھپٹ سے کیوں کر بچتا؟ گھونسے تو اس پر کارگر نہ ہوتے۔

صاحب: (کچھ سوچ کر) اچھا آپ ہمارے کسی گھونسے باز کے مقابلے میں کیا کریں گے؟

آغا: کوئی گھونسے باز سامنے ہو تو بتاؤں۔ ایک گھونسے کے بعد شاید اس کا ہاتھ مدتوں گھونسا نہ بنا سکے۔

صاحب: ہم آپ کی اس شیخی کی حقیقت معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ ہم اپنے طریق پر اگر گھونسا ماروں تو آپ کیا کریں گے؟

آغا: (ہنس کر) مگر میں آپ کو گھونسا مارنے کی صلاح نہیں دوں گا۔ آپ حاکم وقت ہیں

اور میں ایک گوشہ نشین امن پسند۔

صاحب: کچھ مضائقہ نہیں۔

ڈپٹی صاحب: کوئی دوسرا انگریز اس وقت دلی میں ایسا نہیں جو گھونسا بازی جانتا ہو۔

صاحب: (گھنٹے کی طرف دیکھ کر) قلعہ میں ایک میجر ہمارا دوست ہے۔ گھونسا بازی کا پورا مشاق۔ وہ شاید ابھی آجائے۔

استنے میں بیرے نے آکر میجر کا کارڈ دیا۔ صاحب نے اسے اندر بلا لیا۔ دو چار باتوں کے بعد صاحب نے میجر سے کچھ انگریزی میں کہا۔ اس نے آکا کی طرف بغور دیکھا اور ٹوٹی پھوٹی اردو میں بولا۔ تم بڈھا آدمی ہم سے گھونسا بازی کرنا مانگتا ہے؟

آکا: بازی وازی ہم کچھ نہیں جانتے۔

میجر۔ پھر؟

آکا: تم گھونسا چلاؤ ہم دیکھیں وہ کیا چیز ہے۔

میجر: تم کیا کرے گا۔ اگر مر گیا؟

آکا: خون معاف۔ لیکن اگر تمہارا ہاتھ ٹوٹ گیا۔

میجر: (قہقہہ لگا کر) کچھ پروا نہیں۔

آخر فیصلہ یہ ہوا کہ جہاں تک ممکن ہو ضرب شدید سے احتیاط رکھی جائے۔ چنانچہ میجر صاحب نے کوٹ اتار دیا۔ قمیض کی آستینیں چڑھالیں اور آکا کی طرف اشارہ کیا کہ آئیے میدان میں۔

آکا: آپ گھونسا بازی شروع کیجئے۔

میجر (ہنس کر) بیٹھے بیٹھے لڑے گا کیا؟

آکا: لڑنا کیا۔ تمہارے صاحب کو ایک ذرا سا چٹکلا دکھانا ہے۔

میجر نے ڈپٹی کمشنر کی طرف دیکھا۔ انہوں نے سیّد ہادی حسین سے کچھ کہا، سیّد صاحب نے گردن ہلا دی۔ صاحب نے میجر کو اشارہ کر دیا۔ وہ پینترا بدلتا گھونسے ہلاتا آکا پر چلا۔ آکا دیکھتے رہے، جب میجر آکا کے قریب پہنچا اور گھونسا ان کے منہ پر مارنا چاہا تو یکایک معلوم ہوا جیسے درخت کا گدّا لوٹا۔ پلک جھپکنے کی دیر تھی میجر صاحب زمین پر چیت پڑے ہوئے دکھائی دیے اور آکا صاحب پہلے کی طرح بڑے اطمینان سے کرسی پر بیٹھے تھے، صاحب اور ڈپٹی صاحب اُٹھ کر میجر کے قریب گئے۔ پوچھا کیا ہوا۔ کہنے لگے ہمیں کچھ نہیں معلوم۔ ہم نے گھونسا مارنا چاہا۔ بڈّھے نے ہاتھ مروڑ کر ہمیں گرا دیا۔

صاحب: (آکا سے) ہم تو کچھ نہیں دیکھ سکے۔ ہم نے سمجھا تھا کہ آپ کے فن کا میجر صاحب کے فن سے دو چار منٹ مقابلہ ہو گا۔ اس لئے پوری توجہ نہیں کی۔

آکا: ہمارے فن میں مقابل سے کھلاڑیاں کرنا کیا معنی؟ میجر صاحب نے گھونسا مارا ہم نے کیلی کر کے انہیں پچھاڑ دیا۔ البتّہ اتنی رعائت کی کہ ان کا ہاتھ سلامت رہا۔ اگر ایسے موقع پر واقعی کوئی دشمن ہوتا تو کہنی اتر جاتی یا بازو ٹوٹ جاتا۔

صاحب: کیلی کیا؟

آکا: ہتھیار چھیننے کا ایک داؤں ہے۔ مارنے والے کا ہاتھ پکڑ کر مروڑ دیتے ہیں۔

صاحب: مگر آپ نے تو بجلی کی سی پھرتی کی۔

آکا: ہمارے فن میں پھرتی ہی سے سارے داؤں ہوتے ہیں۔

میجر صاحب نے دو چار منٹ تو اپنے ہاتھ کو پہنچے سے لے کر شانے تک سہلایا۔ اس کے بعد آکا کے قریب آ کر آکا کو پہلے تو بڑے غور سے دیکھا۔ نہ اُن کی تیوری پر بل نہ کپڑوں پر شکن

نہ ان کا سانس چڑھا ہوا تھا۔ پھر بڑے تپاک اور نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ آکا سے ہاتھ ملایا اور کہا کہ کیا آپ طمنچہ اور بندوق کی گولی کا مقابلہ بھی کر سکیں گے۔

آکا: بندوق مارنے والا اگر سامنے ہے تو ایک دفعہ شاید اس کی گولی بھی بچا جائیں گے۔

صاحب: ناممکن ہے۔

آکا: آپ نے گھونسے بازی کا تماشا تو دیکھ ہی لیا۔ اب ان سے کہئے کہ طمنچہ چلائیں۔ خدا نے چاہا تو چلنے سے پہلے طمنچہ زمین پر پڑا ہوگا۔

صاحب نے میجر کی طرف دیکھ کر اس سے انگریزی میں کہا کہ لگے ہاتھوں اس بڈھے کا یہ کمال بھی دیکھ لینا چاہئے۔ لیکن ریوالور میں کارتوس نہ ہو تاکہ اسے نقصان نہ پہنچے اور صاحب نے اپنا ریوالور میجر کو دیا۔

آکا اُٹھ کھڑے ہوئے۔ میجر نے ریوالور ہاتھ میں لیا اور دو چار قدم پیچھے ہٹ کر ریوالور تانا۔ ریوالور بندوق کی طرح نشانہ باندھ کر نہیں مارا جاتا۔ بلکہ اس کی نال اونچی کر کے آہستہ آہستہ سیدھا کر کے مقابل پر پھونکتے ہیں۔ چنانچہ میجر نے ریوالور ابھی سیدھا بھی نہیں کیا تھا اور اس کی گھوڑی دبانی چاہتے تھے کہ آکا ایک دفعہ ہی اپنی جگہ سے اُڑے۔ ریوالور کی نال سیدھی ہونے نہیں پائی تھی ہاتھ نیچے آ ہی رہا تھا کہ آکا کے ہاتھ کی گدی اس کی کلائی پر اس زور سے پڑی کہ ریوالر چھوٹ کر دور جا پڑا اور میجر صاحب ہاتھ پکڑ کر رہ گئے۔ آکا پھر بڑے اطمینان کے ساتھ اپنی کرسی پر جا بیٹھے

صاحب: آپ نے کیا کیا؟

آکا: (مسکرا کر) اسے ہت کٹی کہتے ہیں۔ میرے پاس لکڑی ہوتی تو یہی داؤں لکڑی سے کرتا۔ لکڑی نہیں تھی۔ میں نے لکڑی کا کام اپنے ہاتھ کی گدی سے لیا۔

صاحب ڈپٹی کمشنر بہت متاثر ہوئے۔ سید ہادی حسین خاں سے اُنکی تعریف کی اور فرمایا کہ اگر یہ ہم سے کبھی کبھی ملتے رہیں تو اچھا ہے۔

تھوڑی دیر بعد آکا رخصت ہو کر گھر آئے اور اس روز سے مرزا رفوگر کی دکان پر بیٹھنا بھی کم کر دیا۔

اب ایسے لوگ کہاں۔ قلعہ کی جو رہی سہی یادگاریں تھیں وہ بھی اُٹھ گیئں۔

کومل زنانہ

ہیجڑوں، بھانڈوں اور زنانوں کا بھی ہندوستان میں بڑا زور تھا۔ درباروں سرکاروں تک رسائیاں تھیں۔ دنیا میں اور جگہ بھی یہ مخلوق پیدا ہوتی ہو گی، لیکن خدا جانے وہاں اُنھیں کس نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ہمارے ہاں تو اُن کی خوب آؤ بھگت تھی۔ جس محفل میں یہ نہ ہوتے رانڈ سمجھی جاتی۔ ان میں بھی بڑے بڑے نامی گزرے ہیں۔ کچیل، گلزار بھانڈ، شہزادہ، دولھا ہیجڑے، شام گھٹا اور کومل زنانے اپنے اپنے وقت کے چمکتے ہوئے ستارے تھے۔

وہ جو کہتے ہیں جسے پیا چاہے وہی سہاگن۔ کسی نے سچ کہا ہے ؎

خاکسارانِ جہاں را بحقارت منگر
تو چہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد

دنیا والے اُنھیں کسی نظر سے کیوں نہ دیکھیں، کیسا ہی حقیر و ذلیل سمجھیں، اللہ میاں کی مہربانیاں خاص نہیں عام ہیں۔ بارش جب ہوتی ہے کوڑی اور باغ پر یکساں۔ سورج جب چمکتا ہے پھول اور کانٹے سب اُس کی شعاعوں سے برابر مستفید ہوتے ہیں ؎

سنگ کیوں لعل ہوا؟ نیرِ اعظم کی نگاہ
دانہ کیوں سبز ہوا؟ مکرمتِ ابرِ سیاہ

ایسی اچھوتی مخلوق میں بعض بعض مائی کے لال صاحبِ کمال بھی تھے۔ کہتے ہیں آخری وقت میں غدر کے بعد کا ذکر ہے ایک ہیجڑے کو حج کی دُھن سمائی تو اپنے سارے دھندے چھوڑ

اگلے پچھلے گناہوں سے توبہ کر، گہنا پاتا بیچ سفر کی تیاری کرلی۔ سُن رکھا تھا کہ گندی کمائی کے روپے سے حج نہیں ہوتا۔ مولویوں کے پاس پہنچا لیکن سب نے دھتکار دیا بہت پریشان، دل میں شمع رسالت کی لو لگی ہوئی۔ خیال آیا درویشوں سے پوچھنا چاہئے۔ اُن دنوں ایک رند مشرب کی ملنگ شاہ میر کی بڑی شہرت تھی۔ ہچکچاتا ہُوا اُن کے پاس پہنچا، شراب کا دور چل رہا تھا دُور سے دیکھتے ہی بولے

"ابے حرام حلال کرنے والوں کے پاس جا، یہاں تو پینی پڑے گی" بیچارا چپ کھڑا ہو گیا

شاہ میر: حج کا ارادہ اور مولویوں کی معرفت؟

ہیجڑا: حضور سب کہتے ہیں کہ تیرا روپیہ گندا ہے۔

شاہ میر: پھر وہ اپنی کوثر کا چھینٹا دے کر پاک نہیں کر سکتے؟

ہیجڑا غریب کیا جواب دیتا۔ چُپ منہ دیکھنے لگا۔

شاہ میر: کھڑے کھڑے جاتے گا؟ بیٹھتا کیوں نہیں۔

ہیجڑا: (بیٹھ کر) حضور!

شاہ میر: (شراب کی پیالی بھر کر) لے یہ تو پی۔

ہیجڑا: قبلہ توبہ کر چکا ہوں۔

شاہ میر: تو حج بھی ہو چکا۔ ابے اسی میں غوطہ مار کر حج ہو گا۔

ہیجڑا: پیر و مرشد۔

شاہ میر: جا تو پھر مولیوں سے فتویٰ لے۔ یہاں تو اسی راہ سے حج کو بھیجا کرتے ہیں۔

شاہ صاحب کی لال لال آنکھیں دیکھ کر کچھ تو وہ ڈرا اور کچھ اُن پر اعتقاد، جھٹ پیالہ اٹھا منہ سے لگا لیا۔ عجب مزا پایا۔ شراب کیا تھی، دودھ اور شہد کے گھونٹ تھے۔

شاہ میر: ہاں بھئی حج کو جاؤ گے؟ کتنا روپیہ ہے؟

ہیجڑا: کچھ کم دو ہزار۔

شاہ میر: اچھا، کل اسی وقت یہاں لے آنا۔ ہم اسے پاک کر دیں گے۔

ہیجڑا کچھ دیر بعد وہاں سے اُٹھ کر اپنے گھر آیا۔ دن بھر اور رات بھر سوچتا رہا کہ روپیہ کس طرح پاک ہو سکتا ہے؟ شرابیوں کی باتیں ہیں، کوئی اور فتور نہ پڑ جاتے۔ صبح ہوئی دل دھکڑ پکڑ تھا، مگر حج کی چیٹک بھی لگی ہوئی تھی۔ روپیہ پوٹلی میں باندھ سیدھا تکیے پہنچا۔

شاہ میر (ہیجڑے کو دیکھتے ہی پکار کر) آ گئی سونے کی چڑیا (اپنے چیلے چانٹوں سے) کیا دیکھتے ہو لوٹ لو بھئی بنا تیں گے۔ خدا نے دن پھیر دیے۔

وہاں کیا دیر تھی اور ہیجڑے بچارے کی کیا ہستی۔ جا دبوچا۔ پوٹلی چھین حصے بخرے ہونے لگے۔ اُس کی سٹی گم، حواس باختہ، نہ لڑنے کی طاقت نہ واویلا مچانے کا دھرم۔ جنگل بیاباں قبرستان میں کون اُس کی فریاد سنتا۔

شاہ میر: کیوں بھئی حج کو جانے کا ارادہ ہے؟

ہیجڑا: (آنسو بہا کر) میاں، اب میں کیا کروں؟ حرام حلال کی جیسی کمائی تھی وہ بھی تم نے لٹوا دی۔

شاہ میر: اللہ کو یاد کرو۔

ہیجڑا: ہارے کی فریاد اللہ ہی سننے والا ہے۔

شاہ میر: تو بھائی پاؤں پیدل چلے جاؤ۔

ہیجڑا: میاں اتنا دم ہوتا تو اب تک کبھی کا چلا جاتا۔

شاہ میر: (پیالہ بھر کر) اچھا لو، اسے پیو اور تمہاری ہم کیا خاطر کریں۔ گڑ ہو نہیں حج

کو جانے کا بھی انتظام ہو جائے گا۔

ہیجڑا: (دم بخود)

شاہ میر: (لال لال آنکھیں چمکا کر) پیتا ہے یا نہیں۔ زیادہ نخرے کیے تو یاد رکھ ابھی سونٹا پڑنے لگے گا۔

ہیجڑا غریب سہم گیا، پینی پڑی۔ اب کے مرشد کے پیالے میں کچھ اور رنگ تھا۔

شاہ میر: (اپنے چیلوں سے) یارو، ایک غریب حج کو جانا چاہتا ہے۔ حسبِ توفیق اس کی مدد کرو۔ جو جس کے پاس ہو، اسے دے دو۔ اتنا کہنا تھا کہ سب نے اپنی اپنی ٹوٹ کے روپے نکال کر سامنے رکھ دیے۔ ہیجڑے کو حیرت ہوئی۔ رومال پھیلا جلدی جلدی سمیٹنے لگا۔

شاہ میر: بس بھئی اب تو خوش ہوتے۔ لو سدھارو اور جا کر اپنے مولویوں سے فتویٰ بھی چاہے لے لو۔ اٹھو روانہ۔ پیرِ مغاں سے ہمارا بھی سلام کہہ دینا۔

چنانچہ اسی سال وہ حج کو گیا اور وہیں کا ہو رہا۔ ہر برس حاجی آ کر سناتے کہ ہیجڑے کی تو تقدیر کھل گئی۔ روضۂ اقدس پر اپنے سر کے بالوں سے جھاڑو دیا کرتا ہے ؎

کیا شان دکھائی ہے اے سوختہ سامانی

اُس شمعِ رسالت کا پروانہ بنا دیکھا

کوئل زنانہ نام سے ظاہر ہے کہ آبنوسی رنگ کا ہوگا۔ کوئل کو تو مرے ہوئے کم از کم چالیس برس ہوئے ہوں گے۔ شام گھٹا تو ابھی کوئی پندرہ برس ہوئے مرا ہے۔ حج کر کے خاصی صوفیوں مولویوں کی سی وضع اختیار کر لی تھی۔ کوئل کا رنگ اس سے زیادہ وارنشی تھا۔ لڑکپن کے زمانے کا کیا پوچھنا۔ زنانوں کی ٹولی میں جب پہلے پہل گایا ہے تو عاشق مزاجوں کے دلوں کا ٹھراؤ کر دیا۔ دلّی کے ہیجڑا پرستوں کا اُس کے کوٹھے پر رمنا لگ گیا۔ کہتے ہیں گیو کارخانہ دار کے بیٹے

سانولیا نے اسی پر افیم کھائی تھی۔ لال کنوئیں پر کئی دفعہ چاقو چلے تھے۔ ہیجڑوں کی وضع قطع۔ بولی ٹھولی تو دیکھی سنی ہوگی، کوئل کی رسیلی آنکھیں، چمکیلا رنگ، صاف ستھرا ناک نقشہ، پھرپھبن۔ اس بانکپن پہ کون نہ مرتا۔ اچھے اچھے ثقہ آنکھیں چرا چرا کر دیکھتے۔ صوفیوں کو دھوئیں میں بجلیاں چمکتی نظر آتیں۔ طور کا جلوہ دیکھتے۔ کہنیا بن کر جس وقت وہ بانسری بجاتا، اس کی آواز پر ہزاروں برسوں کی بھٹکی ہوئی گوپیوں کی روحیں جمع ہو کر تھرکنے لگتیں۔

لیکن رہے نام سائیں کا۔ جوانی کا سایہ کیا اٹھا، روپ کیا ڈھلا کہ کوئل آندھی کا کوا بن گئی۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ پھجو شاہ ایک مجذوب فقیر نے اپنا کرشمہ دکھایا یہ اُن کے پاس اکثر جایا کرتا تھا۔ انہوں نے سر دھنتے دھنتے سونٹا زمین پر مار کر کہا: "مانگ کیا مانگتا ہے؟ اس وقت چودہ طبق کھلے ہوئے ہیں۔ بول بادشاہ بنا دوں یا اپنا بنا لوں؟" انہیں یہ رٹ لگی ہوئی تھی اور کوئل حیران۔ جب پھجو شاہ کا جوش زیادہ بڑھا تو وہ سونٹا زمین پر مارتے مارتے کھڑے ہو گئے اور اس نے دیکھا کہ مجھے نہ پیٹنے لگیں تو دور بھاگ کر بولا: "سائیں نہ میں بادشاہ بننا چاہتا ہوں اور نہ تم جیسا۔ دعا کرو عمر بھر میاں کو رجھایا کروں۔ میاں ریجھ گئے تو بیڑا پار ہے۔"

اتنا سنتے ہی پھجو شاہ کا جوش ٹھنڈا ہو گیا۔ سونٹا ہاتھ سے پھینک دیا اور قہقہہ لگا کر بولے "جا جنگل میں مورنا چا کس نے دیکھا۔ جا میاں کو رجھایا کر۔ اُن کے من میں آگئی تو کسی دن ریجھ بھی جائیں گے۔"

اُس روز کے بعد سے کوئل کی کایا پلٹ گئی۔ کیسا گانا بجانا، کہاں کا ناچنا تھرکنا، تالیاں پٹخارنا۔ کوئی ہفتہ بھر نہ گزرا ہوگا کہ کوٹھے پر سے بھی غائب۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ کوئی کہتا کسی کے ساتھ بھاگ گیا۔ کوئی کہتا بھاگنے کی رُت میں تو بھاگا نہیں۔ پھجو شاہ کی ہوا لگ گئی۔ دو دو ہفتے سے رنگ کچھ بدلا ہوا تھا۔ غرضیکہ یونہی تذکرے ہو ہو کر رہ گئے۔ شہروں میں ایسے بہتیرے واقعات

ہوتے ہیں۔ کون ڈھنڈیا مچاتا ہے۔ اُس کے ساتھیوں کو البتہ صدمہ ہوا۔ آخر وہ بھی بیٹھ رہے۔

پرانا قلعہ اُن دنوں گوجروں کی بستی تھی اور سڑک کے دونوں طرف دلّی دروازے سے نظام الدین تک جنگل، نہ رات دن لاریاں موٹریں دوڑتی تھیں نہ تانگوں کا تانتا تھا۔ کبھی کبھی اِکّے بہلیاں یا اُونٹ گاڑیاں دکھائی دے جاتیں۔ پیدل جانے والے بھی صبح سے شام تک دس بیس ہی آتے جاتے نظر آتے۔ ہاں سترھویں کے عُرس پر خوب چہل پہل ہو جاتی۔ خوانچے والے خوانچے لئے۔ کھلونے والے اپنی اپنی چیزیں سروں پر رکھے۔ نانبائی، حلوائی، بھٹیارے اپنے اپنے ٹنڈیرے بھٹیوں پر لادے چلے جا رہے ہیں۔ مجھولیاں، شکریں، پالکی گاڑیاں، یکّے، بہلے سنوپے گھڑ دوڑ لگا رہے ہیں۔ تیس چالیس برس پہلے تک ہانڈی شاہ کا مزار تو تھا، مگر نہ یہ ہندوؤں کی نمائش تھی نہ چند اہلِ باطن کے سوا اس مزار پر کوئی فاتحہ پڑھتا، منّتیں ماننا اور ہنڈیاں چڑھانا تو کیا؟ یہ جگہ تقریباً دلّی اور نظام الدین کے آدھوں آدھ رستے پر ہے۔ گرمی کے موسم میں مسافروں کو پانی کی بڑی تکلیف ہوتی۔ دھوپ کی شدّت خاک کا اڑنا، خاص طور پر عُرس کے دن لوگ کبھی کبھی پانی کے لئے پھڑک پھڑک جاتے۔ کوئل نے شہر سے نکل یہیں کہیں کسی ٹوٹے پھوٹے مقبرے میں اپنا آشیانہ بنا لیا اور سڑک کے کنارے دو چار مٹکے رکھ کر سبیل لگا دی۔ بدلا ہوا روپ تھا۔ اوّل اوّل تو کسی نے پہچانا نہیں۔ آتے جاتے مسافر درختوں کے سائے میں بیٹھتے، منہ ہاتھ دھوتے، ٹھنڈے ہوتے، پانی پیتے، سستاتے اور اپنا رستہ لیتے۔ سبیل لگانے والے کو کون پوچھتا۔ کسے اتنی پڑی تھی کہ اس کے حال کی کُرید تا۔ ڈر ہوتا کہ فقیر یا تکیے دار کچھ سوال نہ کر بیٹھے۔

پُرانے قلعے کے شریر گوجروں کو اس سے بَیر ہو گیا تھا، اس لئے کہ ان کی بٹ ماری میں فرق آگیا۔ سڑک پر ایک قسم کی چوکی لگ گئی تھی۔ بیچارے کے کبھی مٹکے پھوڑ جاتے، کبھی اس کے چبوترے پر لید گوبر ڈال دیتے اپنے کنوئیں سے اُس کا پانی بھرنا بند کر دیا۔ غریب کو دُور دُور سے پانی لانا پڑتا

دن بھر مٹکوں کی چوکسی کرتا اور شام کو تھوڑی نیند لے کر پہلے پانی بھرتا، پھر اندھیری رات ہوتی تو اندھیرے میں، چاند نکلا ہوا ہوتا تو چاندنی میں اکیلا تالیاں بجا بجا کر خوب لہکتا، خوب مٹکتا اور صبح تک یہی سانگ رکھتا۔

اس کے چبوترے پر ایک دن عصر کے وقت دو چار نمازی مسافر بھی آگئے اور انہوں نے اذان دے کر نماز پڑھی۔ کسی گوجر نے دیکھ لیا۔ اُس نے جا اوروں سے کہہ دیا: "ارے، اب تو ماہرے پڑوس اجان بھی ہونے لگی، نماج بھی لوگ باگ پڑھنے لگے۔ آج سورے کو مار گیرو۔" آدھی رات کو دو چار مرد، دو چار عورتیں مل کر کوٹل کے تکیے پر آئے تاکہ اُس کا بکھیڑا صاف کر دیں۔ سڑک کے ابھی اُس پار تھے گانے کی آواز کانوں میں پڑی۔

ایک جاٹ : ارے یہ گامے کون ہے ؟

دوسرا : واہ جی واہ آواج بھنبیری۔

ایک عورت : زنانوں کے سے گیت گاٹے ہے۔

پہلا جاٹ : تالیاں بھی دیئے ہی پیٹے ہے۔

دوسری عورت : ماہرا کیا بگاڑے ہے کا ہے کو ستاڈ ہو۔ آجا رے چھورے آجا۔ جانے بھی دے۔

دوسرا : ہاں کاکا، غریب ہمارا کیا لے ہے۔ کہہ دیں گے۔ کہ اجان وجان نماج وماج نہ پڑھوائے اور ماہرے کسی کام میں نہ بولے۔

دوسری عورت : چل تو ابھی کہہ دے نا۔ پاس سے گانا بھی سُن لیں گے۔

کوٹل کی آنکھیں بند تھیں۔ ہاتھ مٹکا مٹکا اور تالیاں پٹخار پٹخار کر مٹک رہا تھا: "آجا میرے سنولیا لوں تیری بلیاں" کی دھن بندھی ہوئی تھی۔ گوجر پہلے تو کھڑے تماشا دیکھتے رہے پھر لیکا یک

انہیں ہنسی چھوٹی۔ گنواروں کا ہنسنا جیسے پہاڑی کے پتھر لڑھکے۔ کوئل کا دھیان بھکا اور وہ سہم کر ان لٹھ بند گنواروں کو دیکھنے لگا۔ دو منٹ بعد جب ذرا اوسان درست ہوئے تو بولا: "چودھری، آدھی رات کو کہاں سے آ رہے ہو؟"

گوجر: ارے تُو گائے تو خوب ہے۔

کوئل: چودھری، میں نگوڑی گانا کیا جانوں، اپنے سنوریا کو رِجھا رہی تھی۔

گوجر: ارے یہ تو زنانہ لگے ہے۔

عورت: جب ہی ایسا ٹھسکے تھا۔

گوجر: چلو رے گھروں کو چلو۔ رات بہت آئی بھورے، اب نہ ستائیو اسے۔ گام (گاؤں) میں کہہ دیجیو کہ پانی بھرنے آئے تو کوئی نہ روکے۔

جان بچی لاکھوں پائے، مگر بستی میں سب جان گئے کہ ٹکیے والا زنانہ ہے۔ اب سترھویں کا عُرس آ گیا تھا کوئل نے نئے کپڑے بنائے، کرتا سبز رنگا، گُل انار دوپٹہ، اس پر دھنک ٹانکی۔ چار ٹھسکے پہلے تھے، چار اور لایا۔ شاموں شام اُن میں پانی بھرا۔ کپڑے بدلے، بال بکھیرے اور لہک لہک کر گانا شروع کیا۔ تھوڑی دیر میں دلّی والوں کی بھیڑ لگ گئی۔ زیادہ دنوں کی بات نہ تھی اکثر نے پہچان لیا آوازے کسنے لگے۔ کوئی پھبتیاں اُڑاتا، کوئی گانے کی فرمائش کرتا: "کوئل سُنے ہوئے مدّت ہو گئی ہے خوب پردہ ہے کہ چلمن سے لگے بیٹھے ہیں، سُنا دو۔"

"نہیں بھئی، میں اپنے مولا کی جوگن بنی" ہو جائے۔"

"ارے لنڈوری کو کیوں ستاتے ہو۔"

کوئل پہلے تو چپ بیٹھا رہا، پھر "میں اپنے مولا کی جوگن بنی" گانے لگا۔ سماں بندھ گیا۔ بہار کشوں، اکّوں سے سڑک بھر گئی۔ اتنے میں ایک بگھی گاڑی آئی۔ بھیڑ میں گھوڑے بدک گئے

اور ایسے بدکے کہ قابو میں نہ آئے۔ سواریوں کو اُترنا پڑا۔ رات کے کوئی آٹھ بجے ہوں گے۔ گاڑی میں ایک سفید لمبی ڈاڑھی کے پیر صاحب تھے۔ مریدوں کی ٹولی ساتھ تھی۔

پیر صاحب: (مُرید سے) یہاں لوگ کیوں اکٹھے ہیں؟

مُرید: حضور کسی زنانے نے سبیل لگا رکھی ہے۔

پیر: لاحول ولا قوۃ۔ زنانہ!

مرید: کہتے ہیں یہاں کا پانی بڑا ٹھنڈا ہوتا ہے۔ نوش فرمائیں تو حاضر کروں؟

پیر: زنانے کا پانی پینا حرام ہے۔ مگر آؤ دیکھیں تو سہی، کم بخت گا بھی رہا ہے (کوئل کی صورت دیکھ کر اور گانا سُن کر) مردود ہے۔ شیطان نے کیا سانگ بھرا ہے۔

کوئل: (پیر صاحب کی طرف دیکھ کر) میاں مَیں قربان خفا کیوں ہوتے ہو۔ اپنے پیا کی جوگن بنی، بروگن بنی۔

پیر: مجسّم شیطان ہے۔

کوئل: میاں۔ کوئل کی کُوک سے ناراض نہ ہو میں تو اپنے میاں کو رجھا رہی ہوں۔

پیر: استغفر اللہ۔ (مریدوں سے) تنکرم کے گھوڑے ہو گئے؟

کوئل: مَیں صدقے، پانی لاؤں؟ کورے کورے سوندے سوندے مٹکوں کا پانی ہے۔ برف سے زیادہ ٹھنڈا۔

پیر صاحب نے نہایت غصّے سے کوئل کو دیکھا۔

کوئل: میاں اللہ کے نام کی سبیل ہے۔ لونڈی نے نہا دھو کر مٹکے بھرے ہیں اور کچھ نہیں تو مُنہ ہاتھ ہی دھو لیجئے۔

یہ کہہ کر کوئل نے ایک کوری بدھنی بھری اور پیر صاحب کے پاس لے کر آیا۔ پیر صاحب کو

طیش آرہا تھا۔ جریب ہاتھ میں تھی جریب سے جو ٹھوکا دیتے ہیں تو بدھنی کوئل کے ہاتھ سے چھوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔

پیر صاحب کا غصہ ذرا ٹھنڈا ہوا۔ کوئل کی مایوس شکل دیکھی کچھ ترس بھی شاید آگیا۔ مگر زاہدانہ غرور کی شان بھی دکھانا چاہتے تھے۔ مریدوں سے جھلا کر کہنے لگے۔

"عجیب اتفاق ہے۔ پہلے ریل میں دیر لگی، اب شیطان نے رستہ روک لیا۔ ہماری زیارت کا بندھا ہوا وقت ہے۔ محبوبِ الٰہی کے دربار میں انتظار ہوگا۔ دیکھو بھئی، جلدی کرو۔ ایک روپیہ اس بدبخت کو بھی دے دو۔ اس کا بدھنی کا نقصان ہوا ہے۔"

کوئل: (مٹکتے ہوئے آگے بڑھ کر دُور سے بلائیں لینے کے بعد) میں واری، یہ روپیہ میری طرف سے میاں پر نچھاور کر دینا۔

پیر صاحب: (غصے اور نفرت سے) دُور ہو خبیث، مجھے بھی گنہگار کرتا ہے۔ نہ ہوا آج عالمگیر کا زمانہ۔ ابھی تجھے تیروں اُڑوا دیا جاتا۔ ایک زنانہ گندگی کی پوٹ اور محبوب الٰہی کا نام لے۔

کوئل: (تھر تھر کانپ کر) حضور، میرا تو اس روپے کو ہاتھ تک نہیں لگا ہے۔ حضور ہی کی مایا ہے۔ میاں نے قبول نہ کیا تو خادموں کے کام آجائے گا۔ میری کمائی کا تو نہیں۔

پیر صاحب کو نجانے کیا خیال آیا۔ خادم کے ہاتھ سے روپیہ لے کر اپنی جیب میں ڈال لیا۔ گھوڑے ٹھیک ہو گئے تھے۔ گاڑی کی طرف چلے۔

کوئل: (پکار کر) حضور، میاں سے کہنا کہ یہ کوئل زنانے کی نذر ہے۔ اسے قبول کر لو اور جب تک میاں کا ہاتھ لینے کو نہ نکلے، کسی کو دینا نہیں۔

پیر: پورا شیطان معلوم ہوتا ہے۔ مسخرے کی باتیں تو سنو۔ نعوذ باللہ۔

پیر صاحب مع مُریدوں کے گاڑی میں بیٹھے۔ گاڑی روانہ ہوگئی۔

جنگل میں منگل تھا۔ درگاہ کے قریب سڑک سے اُترتے ہی آدمیوں کی بھیڑ تھی۔ سودے والوں کا غل، دکانوں پر شامیانے تنے ہوئے قصہ مختصر پیر صاحب گاڑی سے اُترے، سامان اُتارا گیا جو ملتا، پیر صاحب کے ہاتھ چومتا۔ آپ کی تمکنت، آپ کا تقدس اللہ اللہ۔ نہایت تکلف کے ساتھ درگاہ شریف کے اندر داخل ہوئے قوالی ہو رہی تھی۔ دو خادم آگے، چار پیچھے ہٹو بچو کرتے مزار مبارک کے حجرے میں پہنچے۔ اپنے طریق پر زیارت کی، فاتحہ پڑھی، چند منٹ مراقبے میں بیٹھے، اس کے بعد اُٹھ کر باہر نکلنے ہی والے تھے کہ کوئل کا خیال آگیا۔ پہلے تو اُس کی گنہگار زندگی کا تصور کر کے ناک بھوں چڑھائی، پھر نجانے کس جذبے کے تحت جیب میں ہاتھ ڈالا روپیہ نکالا اور تمسخرانہ لہجے میں آہستہ آہستہ کہ کوئی دوسرا نہ سُن لے، اُس کے الفاظ دُہرائے تھے کہ حیرت کی انتہا نہ رہی ظاہری حجاب آنکھوں کے سامنے سے اُٹھ گئے۔ کیا دیکھتے ہیں مزارِ مقدس کو حرکت ہوئی غلاف ہٹا اور اُس میں سے ایک مرمریں ہاتھ باہر نکلا۔ ہاتھ کیا چاند تھا۔ ساری شمعیں اُس کے آگے ماند پڑ گئیں۔ مشک و عنبر کی لپٹوں سے تمام حجرہ معطر ہو گیا۔ اور کانوں میں آواز آئی: "ہماری کوئل کی نذر لاؤ۔"

پیر صاحب ششدر تھے۔ غرور و تمکنت سب غائب۔ ہاتھ پاؤں کانپنے لگے۔ مٹھی خود بخود کھل گئی۔ روپیہ غائب ہو گیا ہوش جاتے رہے۔ بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ دیکھا محبوبِ الٰہی کا دربار آراستہ ہے اور کوئل حضور کے سامنے بیٹھا "اپنے پیا کی جوگن بنی" گا رہا ہے اور امیر خسروؒ داد دے رہے ہیں آپ نے کچھ دیر کے بعد نظریں اُٹھا کر پیر صاحب کی طرف دیکھا اور تیوری پر بل ڈال کر فرمایا: "پیری سے میری نہیں ملتی۔ اپنی نسبتوں پر یہ غرور! خاک شو پیش ازاں کہ خاک شوی یہ محبوب کا دربار ہے۔ عاشق بن کر آؤ۔ سگِ لیلیٰ سے اس قدر نفرت۔"

پیر صاحب کے جب ہوش ٹھکانے آئے ہیں تو اُن کی آنکھیں کھُل گئی تھیں۔ پیری مریدی، عبادت و تقدس کا سارا طلسم ٹوٹ گیا تھا۔ رات بھر جالیوں سے لگے روتے اور تڑپتے رہے۔ بیتاب تھے کہ کس طرح صبح ہو اور کوئل سے اپنی خطاؤں کی معافی مانگیں۔ خدا خدا کرکے رات گزری، غسل میں شریک ہوئے اور فوراً ہی چل پڑے۔ سورج ابھی پورا نکلا بھی نہ تھا کہ کوئل کی سبیل کے سامنے گاڑی رُکوائی۔ کوئل حسبِ معمول جھاڑو بہار دے، منہ ہاتھ دھو اپنے چبوترے پر بیٹھا گنگنا رہا تھا۔ پیر صاحب اپنے مُریدوں کو گاڑی میں چھوڑ سیدھے کوئل کے سامنے پہنچے اور ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔

کوئل: (چونک کر) میں قربان، میاں کے لاڈلے آگئے۔ بڑے سویرے سویرے لوٹ آئے

پیر صاحب: (نیچی نگاہیں کیے) میاں کے لاڈلے تو تم ہو۔

کوئل: میں نگوڑی پاپن گندی میاں کے دروازے کی کُتیا۔

پیر صاحب: (آگے بڑھ کر کوئل کے قدموں کو چومنے کے ارادے سے) کوئل، اب تم مجھے کانٹوں میں نہ گھسیٹو۔ میں نے اپنی آنکھوں سے تمہارا مرتبہ دیکھ لیا۔

کوئل (پیچھے ہٹتے ہوئے) واری جاؤں۔ میں تو ایک زنانہ ہوں۔ ساری عمر گناہوں میں گزری ہے۔ حرام کے لقمے کھائے ہیں۔ توبہ توبہ۔ آپ اور میرے پاؤں چھوئیں۔ دوزخ کا کندا نہ بنائیے۔ آپ کو میرے میاں نے سہاگن بنایا ہے۔ آپ اُن کے پیارے ہیں۔ مجھے اپنے پیر چھونے دیجئے۔

پیر صاحب: (بھرّائی ہوئی آواز میں) کوئل عقیدت کا درجہ عبادت سے بہت اونچا ہے یہ بھید آج کھُل گیا۔ تقدّس اور شرافت کے سارے کثیف و تاریک پردے اُٹھ گئے۔ تم مجھے زنانے نہیں مردانوں کے مردانے دکھائی دے رہے ہو۔ آج میں سمجھا ہوں

ذات پات پوچھے نہ کوئے
ہر کو بھجے سو ہر کا ہوئے

اور خدا کا پیار حاصل کرنے کا بھی جو ہم سمجھے ہیں وہ طریقہ نہیں۔ نہ جانے کیا ادا اُسے بھا جائے
سچ تو یہ ہے کہ جسے پیا چاہے وہی سہاگن ہو کوئل تم۔ میاں کی زبان سے سن آیا ہوں۔

کوئل: (ایک عجیب قسم کی مسرت کے ساتھ) میاں نے میرا نام لیا سچ؟

پیر صاحب: ہاں کوئل تمہارا نام۔

کوئل: میرا نام، ایک زنانے کا نام۔

پیر صاحب: تم اُن کے سامنے بیٹھے لہک رہے تھے۔

کوئل: مَیں کُتیا بھونک رہی تھی؟ اچھا کیا نام لیا تھا؟

پیر صاحب: سگِ لیلیٰ!

یہ سُنتے ہی کوئل نے "اپنے پیا کی جوگن بنی" کی ایک تان لگائی اور ہاتھوں کو اس طرح جھکاتا
ہوا جیسے کوئی سامنے ہے اور اُس کی بلائیں لے رہا ہے زمین پر گر گیا۔ ہونٹوں پر مُسکراہٹ تھی
اور سر کے بالوں کی نقاب مُنہ پر۔ پیر صاحب نے بڑھ کر جو اُٹھانا چاہا، تو وہاں کیا رکھا تھا۔

*

ڈیوانی پا

آج سے چالیس پچاس پہلے تک دلی کے آسودہ حال شریف گھروں میں دستور تھا کہ کھانے پینے سے فراغت پاکر ڈیوڑھیوں کے کواڑ بھیڑ، دالانوں کے پردے چھوڑ اندھیرا کر چھوٹے بڑے سب اندر لیٹ جاتے۔ کوری کوری صراحیاں رکھی ہیں۔ ماما یا کوئی سیٹنی فرشی پنکھے کی ڈوری ہاتھ میں لیے پنکھا کھینچ رہی ہے اور خود بھی جھونٹے کھا رہی ہے

ہمارے گھر میں بھی یہی انتظام تھا۔ بارہ بجے اور پردے چھوٹے۔ بڑے بوڑھے بال بچّوں کو لے کر پڑ گئے۔ ساری دوپہر اسی طرح گزرتی تھی۔ کوئی سوتا کوئی جاگتا مگر کیا مقدور جو باہر نکلنے پاتا۔ دوپہر ڈھلی جاتی، ظہر کی اذانیں ہو چکتیں تو کوئی دو ڈھائی بجے آہستہ آہستہ ایک ایک پردہ اُٹھنا شروع ہوتا وہ بھی نمازیوں کے لیے ورنہ چار بجے سے پہلے کسی کو صحن میں نکلنے کی اجازت نہ تھی۔ مقصد تو در اصل لُو اور دھوپ کی تیزی سے بچانا تھا۔ لیکن بچّوں کو ڈرانے کے لیے کہا جاتا کہ چڑیلیں پھرتی ہیں۔ بھتنے اور چھل پائیاں آجاتی ہیں۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ ہمارے ہاں آگرے سے پہلے پہل کچھ مہمان آئے ہوئے تھے یعنی ہماری رشتے کی ایک خالہ اور اُن کی لڑکیاں، گرمی کا موسم اور ٹھیٹھ دوپہر کا وقت اپنے قاعدے کے موافق پردے چھوڑ کر سب دالان میں لیٹے باتیں کر رہے تھے دستور تھا کہ جب پنکھا کھینچنے والی آتی تو ڈیوڑھی کی کنڈی لگاتی ہوئی آتی۔ اس دن اتفاق سے نجانے کیا ہُوا کہ وہ کنڈی لگانی بھول گئی۔ کواڑ چوپٹ کھلے رہ گئے۔ کوئی ایک بجا ہوگا خالہ کی لڑکی کو پیشاب

کی حاجت ہوئی اور وہ پردہ ہٹا کر باہر نکلی، آدھے صحن میں پہنچی تھی کہ ڈیوڑھی میں سے ایک مہین سی آواز آئی "آپا میں آؤں؟" نظر اٹھا کر جو دیکھتی ہے تو ایک بڑھیا لال کپڑے پہنے گھونگھٹ نکالے سدا سہاگن بنی اندر جھانکتی ہوئی دکھائی دی۔ لڑکی کے ہاتھ سے لوٹا چھوٹ پڑا۔ ایک چیخ ماری اور ہانپتی کانپتی دالان کی طرف دوڑی۔ گھبراہٹ میں اندر آتے آتے پردہ پاؤں سے اُلجھ گیا۔ بیچاری گر پڑی۔ سب اُٹھ بیٹھے کیا ہوا۔ ٹہنی والا تو نہیں آگیا۔ بیٹی کون دکھائی دیا ہائے ہائے ڈر گئیں۔ بھئی کسی کو ساتھ لے لیا ہوتا۔ آخر منہ سے کہو کس چیز سے ڈریں۔ کتا تو گھر میں گھسا نہیں رہ گیا۔ نگوڑی سینگی والیاں اسی وقت چیلوں کی طرح منڈلاتی پھرا کرتی ہیں کوئی آگئی ہوگی ہائے ڈیوڑھی کی تو کنڈی لگی ہوئی ہے۔

سب اپنی اپنی بولیاں بول رہے تھے اور لڑکی منہ اوندھائے پڑی تھی۔ نہ سر سے کھیلتی نہ منہ سے بولتی۔ اس کی ماں پڑھ پڑھ کر پھونک رہی تھیں کہ اتنے میں پھر آواز آئی "اے آپا! میں آجاؤں؟" یہ آواز سنتے ہی لڑکی نے پھریری لی۔

خالہ، بوا یہ کون آواز دے رہا ہے۔

والدہ: آواز تو آپا دیوانی کی سی معلوم ہوتی ہے مگر ڈیوڑھی کے تو کواڑ بند ہیں۔ یہ کہہ کر وہ اٹھیں اور پردہ ہٹا کر دیکھا۔

والدہ: اے ہاں۔ دیوانی آپا ہیں اور کواڑ چوپٹ کھلے ہوئے۔ انہی کو دیکھ کر لڑکی ڈر گئی ہوگی (پنکھا کھینچنے والی سے) اری نگوڑی کیا آج کنڈی لگائی ہوئی نہیں آئی تھی۔ کوئی چور چکار گھس آتا تو کیا ہوتا۔

پنکھے والی: (جھوٹ بولتے ہوئے) بڑی بیگم صاحب! اپنے دیدوں کی قسم میں نے تو کنڈی لگا دی تھی۔

والدہ: جھوٹی مکار۔ چڑیل پھر کواڑ کس نے کھول دیے۔ دیدوں پھوٹی اُٹھ کر دیکھ۔ یہ تُو نے گنڈی لگائی تھی (لڑکی سے) بیٹی ڈرو نہیں۔ ڈرنے کی کیا بات۔ یہ تو دیوانی آپا ہیں۔ ہماری لڑکیاں تو ان سے گھنٹوں باتیں کیا کرتی ہیں۔ لو میں بُلاتی ہوں تم بھی ان سے باتیں کرو ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہو جاؤ گی۔ بیچاری کا مدتوں سے دل اُلٹا ہؤا ہے لیکن کسی کو ستاتی نہیں بلکہ جہاں جاتی ہیں ان سے فائدہ ہی پہنچتا ہے۔ اللہ کی معصوم بندی ہیں جو کہتی ہیں وہ ہوتا ہے۔

جن دنوں کی یہ باتیں ہیں اس وقت دیوانی آپا کی عمر کوئی ساٹھ برس کی ہوگی بلکہ بصارت سماعت تو کیا ساری بتیسی سلامت تھی۔ بالوں کی خبر نہیں سفید تھے یا کتر بڑے اس لیے کہ جب دیکھا مہندی لگائے۔ مہندی کا وہ شوق تھا کہ ہاتھ پاؤں بھی سدا لال رہتے اور مہندی بھی لگاتیں تو حمامی۔ چہرہ البتہ بڑھاپے سے جھریا کر چھوارا ہو گیا تھا۔ بناؤ سنگھار سے کوئی دم فرصت نہیں ملتی تھی ایک ہاتھ میں کنگھی رہتی ایک میں آئینہ۔ جہاں کھڑی ہوتیں جہاں بیٹھتیں برابر کنگھی کیے، آئینہ دیکھے اور منہ سے یہ کہے جاتیں "اب تو تمہیں پسند آئی۔ اب تو تمہارا دل خوش ہؤا۔ اب تو مجھ سے نہ بھاگو"

وضع یہ تھی کہ لال چوچہاتا دوپٹہ چھپا ٹکا ہؤا۔ لال ہی کرتہ جس میں کرن لگی ہوتی بڑے بڑے پائنچوں کا لال ہی پاجامہ۔ جس کی کلی کلی پہ کیکری کا کام ہوتا۔ پور پور چھلے، انگوٹھیاں کہنیوں تک رنگ برنگ کی چوڑیاں، ناک میں ایک طرف نتھ، دوسری طرف کیل، بیچ میں بلاق۔ کان جیسے شہد کی مکھیوں کا چھتہ۔ بیسیوں بالیاں بالے پتے لٹکے ہوئے، گلے میں چمپاکلی، گلوبند، کئی کئی ہار۔ ماتھے پر ٹیکا۔ اوپر جھومر، پاؤں میں جھانجن۔ پازیب، چوڑیاں غرض کہ پیتل، گلٹ، رانگ وغیرہ کا جو اور جس قسم کا کوئی زیور مل گیا لٹکا لینے سے کام تھا۔ یہاں تک کہ اگر ٹین کی کترن کہیں پڑی ہوئی مل گئی تو اسے بھی ہاتھ گلے میں کسی نہ کسی

طرح لٹکا لیتیں۔ ہونٹوں کا لاکھا، دانتوں میں مسی اور آنکھوں میں کاجل۔ کیا مجال جو کبھی ننگا ہوا ہو۔ نہایت بھولی بھولی باتیں کرتیں۔ باتیں کیا اپنے دولھا کی رٹ تھی۔ آتے ہی کہتیں "اے انہیں دیکھنے نکلی تھی۔ روٹھ گئے۔ میں مناتی پھرتی ہوں۔ اللہ رکھے وہ تو ایسے بُرے نہیں۔ کسی کو بھٹے والی نے جادو کر دیا ہے۔ دیکھو تو آپا مجھ پری کو چھوڑ کر چڑیلوں کے پیچھے رہنا کوئی بات ہے۔" لڑکیوں بالیوں سے ان کا بڑا سہاگ رہتا۔ لڑکیاں چھیڑتیں اور ان کو بُرا معلوم ہوتا تو صرف اتنا کہتیں کہ "آپا تم بھی میرا دل دکھانے لگیں۔"

عام طور پر لوگ انہیں مجذوبہ کہتے تھے، مشہور تھا کہ بڑی پہنچی ہوئی ہیں۔ کہاں پہنچی ہوئی ہیں؟ اس بھید کی کسی کو خبر نہ تھی۔ لیکن اتنا ہم نے ضرور دیکھا کہ جن گھروں میں وہ آیا جایا کرتی تھیں جب تک وہ زندہ رہیں وہاں کوئی غیر معمولی حادثہ کبھی پیش نہیں آیا۔ ہمیشہ لہر بہر رہی۔ کرامتوں کی بابت اور تو کچھ ہمیں معلوم نہیں۔ دو تین واقعات جو میری آنکھوں کے سامنے گزرے وہ سن لو۔ ایک دفعہ بڑے زوروں کی بارش ہوئی۔ سینکڑوں مکان گر گئے۔ بڑی بڑی پکّی حویلیاں رو دیں۔ غریبوں کو سر چھپانے کی جگہ نہ رہی۔ تم نے بڑے بوڑھوں سے ڈھائی ڈھوئی کے مہینہ کا نام سُنا ہوگا۔ وہی بارش تھی۔ پندرہ دن سے پانی تھمنے کا نام نہیں لیتا تھا۔ لوگ اذانیں دیتے دیتے تھک گئے۔ طوفانِ نوحؑ کا مزہ آ گیا۔ اسی اثنا میں دیوانی آپا بھی بھیگتی بھاگتی کہیں سے نکل آئیں۔

والدہ: تم اس مینہ پانی میں بھی پھر رہی ہو؟

دیوانی آپا: ہاں آپا۔ کیا کروں۔ کئی دن سے ان کی خبر نہیں ملی تھی۔ جانے وہ کہاں ہوں گے۔

لڑکیاں: ہوں گے کہاں کہیں کسی مسجد میں بھوکے پیاسے بیٹھے ہوں گے۔

دیوانی آپا: بھوکے پیاسے!

لڑکیاں: اور کیا مینہ تھمے تو نکلیں

دیوانی آپا: وہی برسائیں وہی ڈر کے مارے چھپ بیٹھیں۔

لڑکیاں: کیا مینہ وہی برساتے ہیں۔

دیوانی آپا: اور کون برسائے گا۔ میرے سے بیر باندھ لیا ہے کہ میں انہیں ڈھونڈنے نہ نکلوں۔

والدہ: پھر تم بھی تو ان کی سہاگن ہو۔ ایسا نہیں کرتیں کہ اس جھڑی کو روک دو۔

دیوانی آپا: وہ بُرا تو نہیں مانیں گے؟

لڑکیاں: بُرا مانیں تو تم بھی ان سے روٹھ جانا۔

دیوانی آپا: نہیں آپا۔ دُلہنیں بھی کہیں اپنے دُولہا سے روٹھا کرتی ہیں۔

لڑکیاں: اچھا روٹھنا نہیں۔ خوشامد کر لینا۔

دیوانی آپا: ہاں آپا یہ ٹھیک ہے تو پھر مینہ کو روک دوں۔

والدہ: مینہ رک گیا تو بڑی دعائیں لو گی۔

یہ سُن کر وہ اٹھیں۔ صحن میں جا کر کھڑی ہوئیں اور آسمان کی طرف ہاتھ اُٹھا کر کہنے لگیں میرا سہاگ اُجاڑنے کا ارادہ ہے تو لو برسو خوب برسو۔ آنکھوں کا کاجل دھو ڈالو۔ ہونٹوں کی مسی چھڑا دو۔ ایک دفعہ ہی رنڈیا کیوں نہیں کر دیتے۔ جوڑا تو سارا بھگو دیا اب اور کیا چاہتے ہو؟"

یہی فقرے شاید دوسری مرتبہ ان کے منہ سے نکل پائے ہوں گے کہ یکایک بادل گرج کر پھٹے اور تھوڑی دیر میں دھوپ نکل آئی۔ اللہ نے فضل کر دیا۔

اس کے بعد دوسرا یا تیسرا برس تھا کہ بارش کا کھنچاؤ ہو گیا۔ کھنچاؤ بھی ایسا کہ مخلوق بلبلا

کرنے لگی۔

برسات کے سارے مہینے گزرنے پر آگئے اور ایک بوند پانی کی نہ پڑی۔ ابر آتے اور اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر نکل جاتے۔ نہ ساون برسا نہ بھادوں۔ بنیوں نے قحط کا غل مچانا شروع کر دیا۔ یا روپے کا چوبیس سیر آٹا بک رہا تھا یا ایک دفعہ سولہ سیر رہ گیا۔ استسقا کی نمازیں بھی پڑھی گئیں۔ لوگ دھاڑیں مار مار کر روئے بھی مگر آسمان نہ پسیجا۔

جمعرات کا دن تھا۔ گرمی کی شدت الاماں، گھٹائیں آرہی تھیں لیکن خالی۔ محلّے میں دیے کی تیاری تھی کہ کوئی دو بجے کے قریب آپا دیوانی گھبرائی ہوئی سی اِدھر اُدھر دیکھتی اور کچھ بڑبڑاتی چلی آتی ہیں۔

آپا دیوانی: (انگنائی میں کھڑی ہو کر) آپا! سنتی ہو۔ میری سوکنیں نگوڑیاں کہہ رہی ہیں کہ اب کے تمہارا دولھا تمہیں بھوکا پیاسا مارے گا۔ کیوں آپا کہیں دولھا اپنی دلہنوں کو بھوکا پیاسا مارا کرتے ہیں؟ شفقتوں نے بہت سر اُٹھایا ہے (لرزتی ہوئی آواز میں) الٰہی!

والدہ: ہائیں ہائیں آپا کیا کوسنے لگیں؟

دیوانی آپا، آپا میں بھی انہیں کوسوں گی۔ کیوں نہ کوسوں۔

والدہ: آپا ایسا کام نہ کرنا۔ پہلے ہی مینہ نہیں برس رہا۔ آٹا گھٹتا چلا جاتا ہے۔ اللہ خیر کرے

دیوانی آپا: تو آپا کیا انہوں نے مینہ کو بند کر دیا ہے۔

لڑکیاں: کیا خبر لوگ تو یہی کہتے ہیں۔

دیوانی آپا: تم بھی آپا ان قطاماؤں کی سی کہنے لگیں۔

لڑکیاں: پھر آخر مینہ کیوں نہیں برستا

دیوانی آپا: اب میں کیا جانوں آپا۔ ان کے من کی لہر ہے۔ مجھ سے بیر باندھیں گے تو یہی ہوگا۔

والدہ: آپا۔ اچھا انہوں نے بیر باندھا ہے تو باندھنے دو۔ تم تو بیر نہ باندھو۔

دیوانی آپا: آپا میں تو کسی سے بیر نہیں باندھتی۔

لڑکیاں: بیر نہیں باندھتیں تو ان سے کہو مینہ برساویں۔

دیوانی آپا: میں تو آپا نہیں کہتی

لڑکیاں، تو پھر کسی کے کہنے کا بُرا کیوں مانتی ہو۔

دیوانی آپا: وہ انہیں جو بدنام کرتی ہیں۔

والدہ: مینہ نہ برسے گا تو لوگ یہی کہیں گے۔

دیوانی آپا: اچھا آپا دیکھو۔ میں ان سے کہتی ہوں (چوٹی کھول کر) مہرراج! برسادو کتنے دن سے میرا چونڈا ابھی نہیں دُھلا۔ تم کو کیا اچھا معلوم ہوتا ہے کہ میرے بدن میں سے بُو آنے لگے۔ اپنی دُلہن سے اس طرح آنکھیں نہ پھیرو۔ مہرراج! برسادو، برسادو، برسادو!

خُدا کی شان جو گھٹائیں خالی نظر آ رہی تھیں۔ ایک ہوا کا جھونکا آیا۔ پہلے پھوار پڑنی شروع ہوئی اس کے بعد جو موسلا دھار بارش پڑی ہے تو جل تھل ہوگئے۔ تین مہینے کی کسر چار دن میں نکل گئی۔ اللہ نے سماں کر دیا۔

اسی طرح ایک موقع پر اماں جان کو بخار آیا اور بخار کی شدت میں حبس بول ہوگیا۔ بڑی تکلیف۔ حکیم آ رہے ہیں۔ ڈاکٹر نے گھنٹہ گھنٹہ بھر کے بعد دوا بدلی مگر پیشاب نہیں آتا۔ پیٹ نقارہ ہے۔ ادھر وہ تڑپ رہی ہیں اُدھر سارا گھر پریشان کوئی دوا

کارگر نہیں ہوتی۔ اسی اثنا میں دیوانی آپا نے دروازے میں جھانک کر آواز دی "آپا میں آؤں"۔ یہاں کس کو اتنی مُہلت تھی کہ کوئی انہیں جواب دیتا۔ یا تو وہ بغیر بلائے کبھی اندر آتی نہ تھیں یا آج خودبخود اندر آگئیں۔

دیوانی آپا: آپا! کیا بات ہے بولتی بھی نہیں۔

لڑکیاں: آپا کیونکر بولیں۔ یہاں تو رات سے ست ہی ست پر جان ہے۔

دیوانی آپا: کیا ہوا آپا؟

لڑکیاں: اماں جان کئی دن سے ماندی ہیں۔

دیوانی آپا: (والدہ کی طرف دیکھ کر) آپا تم لیٹی ہو۔ نیند آ رہی ہے۔

لڑکیاں: (ہڑبڑا کر) ہاں بی۔ اچھا اس وقت تم جاؤ۔

دیوانی آپا: کیوں جاؤں آپا۔ میں تو نہیں جاتی (والدہ کے پلنگ کے سرہانے آکر) اے آپا آپا۔ اُٹھ بیٹھو۔

لڑکیاں: ارے بی وہاں سے ادھر آ جاؤ۔ ستاؤ نہیں۔ ساری رات گزر گئی پیشاب کی ایک بوند نہیں آئی۔

دیوانی آپا: کیا موتتی نہیں۔ آپا موت لونا۔

لڑکیاں: (ایک دوسری سے) اس وقت یہ عذاب اور آگیا

دیوانی آپا: آپا موتتی کیوں نہیں۔ اچھا میں بھی موتتی ہوں۔ تم بھی میرے ساتھ موتو۔ یہ کہہ کر وہ انگنائی میں جا بیٹھیں۔ ان کا بیٹھنا تھا کہ اماں جان نے کہا "پیشاب کروں گی" چوکی پر بٹھاتے بٹھاتے پیشاب جو آنا شروع ہوا تو خدا جھوٹ نہ بلوائے کوئی دس منٹ تک برابر آتا رہا۔ دیوانی آپا جب اُٹھی ہیں تو اُنہیں بھی پیشاب سے فرصت ملی ہے

پیشاب آتے ہی آنکھیں سی کھل گئیں۔ کھانے کو مانگا اور پھر بخار بھی نہ آیا۔

اب تو دیوانی آپا کی بڑی خاطریں ہونے لگیں۔ پاس پڑوس کی دو چار بیویاں خیر صلا کو آئی ہوئی تھیں۔ محلہ بھر میں چرچا ہو گیا۔ ان دنوں کس کی مجال تھی کہ پیرونِ مجذوب کے ساتھ کوئی گستاخی کرتا۔ اللہ والوں پر منہ آتا۔ مزاروں کو ٹھکراتا اور مجذوبوں کی ہنسی اُڑاتا۔ چنانچہ دیوانی آپا کی اس کرامت کا فوراً غل مچ گیا۔ جس کو دیکھو زیارت کے لیے چلا آ رہا ہے۔ ایک ہاتھ چومتا ہے تو دوسرا پاؤں۔ ہزاروں فرمائشیں ہونے لگیں۔

عورتوں کے غول دیکھ کر دیوانی آپا گھبرا سی گئیں۔ کبھی پائنچے پکڑے پکڑے بڑبڑاتی ہوئی انگنائی میں جاتیں کبھی دالان میں۔ آخر ایک دفعہ ہی "آپا وہ مجھے بلا رہے ہیں" کہتی ہوئی سر کسے باہر۔ بچے پیچھے پیچھے دوڑے۔ ڈیوڑھی سے نکل کر دیکھتے ہیں تو غائب تھیں۔ اس دن کے بعد مہینوں نظر نہ آئیں۔ کوئی دس مہینے گزرے ہوں گے عید کا روز تھا۔ شام کا وقت کہ "آپا میں آؤں" کی آواز آئی۔

لڑکیاں: اے آپا آؤ کہاں تھیں تم نے تو ترسا دیا۔

دیوانی آپا: (اندر آ کر) آپا جی اچھا نہیں۔

دیکھا تو واقعی چہرہ بہت ہی مرجھایا ہوا تھا۔ بایاں ہاتھ سوجا ہوا۔ بیچ کی انگلی میں پیتل کی انگوٹھی پھنسائی تھی۔ انگوٹھی کھردری ہو گی اس نے زخم ڈال دیا۔ زخم میں پیپ پڑ گئی۔ انگلی دھبجا رہی تھی۔ ہاتھ پہنچے تک اپلا ہو گیا۔

لڑکیاں: اے ہے آپا۔ انگوٹھی کٹوا کیوں نہیں دیتیں۔

دیوانی آپا: واہ وا بھئی واہ وا۔ یہی تو ان کی نشانی ہے۔ اسی کو کہتی ہو کٹوا دوں۔ تم بھی اچھی رہیں۔

لڑکیاں: پھر انگلی کس طرح اچھی ہو گی؟

دیوانی آپا: ہو جائے گی آپا۔ اپنے آپ اچھی ہو جائے گی۔ انہوں نے کہا ہے کہ اسے تھنکارے جاؤ۔

یہ کہہ کر انہوں نے زخم پر تھوکنا شروع کیا اور چپ بیٹھی رہیں۔ برابر تھوکتی رہیں تھوڑی دیر میں چلی گئیں اور پھر ہم نے ان کی صورت نہیں دیکھی۔ کوئی دو مہینے کے بعد یکایک ایک برقعہ والی عورت آئی۔ یاد نہیں کیونکر دیوانی آپا کا ذکر آگیا۔ معلوم ہؤا کہ کل ہی ان کا انتقال ہؤا ہے اور کل ان کے پھول ہیں۔ والدہ چونکہ ان کی بہت زیادہ معتقد ہو چکی تھیں۔ انہوں نے پوچھا۔ "اچھی بوا۔ ان کے پھول کون کرے گا" ؟ اس نے بتایا کہ ردو گروں میں ایک چاند والی حویلی ہے وہاں ان کا رہین بسیرا تھا۔ وہیں وہ مری ہیں۔ وہی لوگ ان کی فاتحہ درود بھی کریں گے۔"

اماں جان نے پوچھا اگر کوئی غیر پھولوں میں جائے تو گھر والے برا تو نہیں مانیں گے وہ بولی۔ "بی اس میں برا ماننے کی کیا بات ہے۔ فاتحہ میں ثواب کے لیے سب ہی جاتے ہیں۔ کسی کا کیا حرج ہے۔"

چنانچہ دوسرے دن اماں جان پھولوں میں گئیں۔ گھر مہمانوں سے بھرا ہؤا تھا اور ایسی مہک تھی جیسے گلاب گندھی کی دکان۔ گھر والیاں دو بڑھیاں تھیں سانولے سانولے رنگ کی مگر نہایت صاف ستھری۔ والدہ نے فاتحہ میں شریک ہونے سے پہلے ان کے پاس جا کر پانچ روپے دیے اور کہا کہ انہیں آپا کے فاتحہ درود میں شامل کر دینا۔ انہوں نے بڑی حجت کے بعد روپے لیے اور بولیں۔ آپ کا مکان تو پنڈت کے کوچہ میں ہے نا؟ آپ کھانا کھائے بغیر نہ جائیے گا۔ آپا نے مرتے وقت کہہ دیا تھا کہ وہ

آئیں تو انہیں کھانا ضرور کھلانا۔

فاتحہ ہو چکی تو جو عورتیں آئی تھیں ان میں سے اکثر اپنے اپنے گھر سدھاریں۔ کوئی پانچ یا چھ بیویاں باقی رہ گئیں۔ گھر کی پکی ہوئی چپاتیاں تھیں اور گھر ہی کا پکا ہُوا آلو کا سالن ایک طباق میں تھوڑا سا حلوا۔ والدہ فرماتی ہیں کہ نہ کبھی میں نے ایسا مزے کا سالن کھایا تھا نہ ایسا لذیذ حلوا۔ یہ بھی آپا کی ایک کرامت سمجھنی چاہیے ورنہ ایسی لذت نہ کسی باورچی کے ہاتھ میں دیکھی نہ رکابدار کے ہاتھ میں۔

کھانے سے فارغ ہو کر دوسری بیویوں نے ڈولیاں منگائیں لیکن والدہ چپکی بیٹھی رہیں۔ ان کے دل میں تھا کہ یہ بیویاں بھی چلی جائیں تو آپا دیوانی کی بابت گھر والیوں سے کچھ پوچھیں کہ یہ کون تھیں۔ کیوں کر دیوانی ہوئیں اور اُن کے دلہن بنے پھرنے کے کیا معنی تھے ؟

تنہائی ہو گئی تو والدہ نے گھر والی ایک بڑی بی سے پُوچھا "بہن آپا ہمارے ہاں کوئی بیس برس سے آتی تھیں لیکن آج تک یہ نہیں کھلا کہ ان کا شہر کے کس گھرانے سے تعلق تھا۔ تم کو تو معلوم ہوگا۔ اچھی کچھ بتاؤ تو سہی"۔

بڑی بی نے ٹھنڈا سانس لے کر کہا کہ "بوا! جیتے جی تو میں نے ان کا یہ پردہ فاش کیا نہیں لیکن اب وہ پردہ کر گئی ہیں اور تم سے اُن کو محبت بھی تھی اس لیے بتا دیتی ہوں۔ پھر بھی نام نہیں بتاؤں گی۔ اتنے پتے سے سمجھ لینا۔ ان کے گھرانے کا تعلق قلعہ سے تھا۔ ان کے والد شاہزادے اور ان کی والدہ شاہزادی تو نہ تھیں ہاں جب تک قلعہ آباد رہا ان کی والدہ کو سب منجھلی بیگم کہتے تھے۔

اللہ اکبر منجھلی بیگم! ان کا ایک قصہ نانا جان سے سُنا ہوا مجھے یاد آگیا۔ اس سلسلے

میں اسے بھی سُن لو۔ کیا وقت تھا اور کیا نیتیں۔ شاہی تو ختم ہو چکی تھی۔ قلعہ والوں کو سر چھپانا مُشکل تھا لیکن شرافت کا ابھی رگوں میں اور امارت کے خیالات ہنوز دماغ میں موجود تھے۔ منجھلی بیگم صاحبہ کی ڈیوڑھی پہ ایک غریب آدمی ملازم تھا۔ اس کی ایک لڑکی تھی جس کی شادی کا زمانہ قریب اور گھر میں دو برتن بھی نہیں۔ چار چیتھڑے کیسے نہ پیسہ پاس جو قاضی الحاجات کہلاتا ہے۔ غریب آدمی بے سرو سامانی کی وجہ سے حواس باختہ ہو رہا تھا۔ ایک دن وہ اپنے لڑکے کو اپنا قایم مقام چھوڑ کر اسی فکر میں کہیں چلا گیا۔ اسی روز اتفاق سے بیگم صاحبہ نے اس کو یاد فرمایا۔ معلوم ہوا کہ وہ تو غیر حاضر ہے اس کا بیٹا اس کی جگہ موجود ہے۔ لڑکے کو بلایا اور پوچھا کہ تمہارا باپ آئے دن کن فکروں میں سرگرداں پھرا کرتا ہے؟ لڑکے نے عرض کیا "حضور کہتے ہوئے شرم آتی ہے"۔

بیگم صاحبہ: نہیں کہو شرمانے کی کیا بات ہے۔

لڑکا: حضور! بہن کی شادی ہونے والی ہے۔ گھس لگانے کو پیسہ پاس نہیں۔ میرا باپ اس دھوڑ دھوپ میں لگا ہوا ہے کہ کہیں سے کچھ قرض اُدھار مل جائے تو اس فرض سے نجات ملے۔

بیگم صاحبہ: تو کیا اب تک جہیز بھی نہیں جُڑا؟

لڑکے نے کچھ ایسے دردناک الفاظ میں اپنے گھر کی بے سرو سامانی کا اظہار کیا کہ بیگم صاحبہ کا دل بھر آیا۔ بہت متاثر ہوئیں۔ تھوڑی دیر کے بعد سیر چشم اور فیاض بیگم نے اپنا ایک دوپٹہ لڑکے کو بھیجا اور فرمایا "اس دوپٹے کے موتی تو نکال لو۔ ذرا احتیاط سے کام کرنا۔ لیکن دیکھنا بھئی چرانا نہیں۔ نیت سلامت رکھنا"۔

دوپٹہ موتیوں سے لسا ہوا تھا۔ تانے میں بھی موتی تھے اور بانے میں بھی۔ لڑکے نے قینچی سے ڈورے کاٹ کر موتی نکالنے شروع کئے اور آنکھ بچا کر ایک مٹھی موتی جھٹ کرتے

میں رکھ نیفنے میں اُڑس لیے۔ جب سب موتی نکل آئے تو بیگم صاحبہ کے حضور میں لے گیا۔ اس میں سے دو مٹھی موتی لڑکے کو عطا کئے اور فرمایا "بھئی یہ موتی اپنے گھر لے جاؤ۔ انہیں بیچ کر اپنی بہن کا جہیز بناؤ اور اس کی برات میں خرچ کرو۔"

یہ منجھلی بیگم تھیں۔ خیر اچھا تو بڑی بی نے کہا منجھلی بیگم کی ان کے سوا کوئی دوسری اولاد نہ تھی۔ غدر کے بعد جب شہر میں امی جمی ہو گئی تو انہیں ان کے بیاہ کا فکر ہُوا برابر کی ٹکر کے ایک خاندان میں بات ٹھہری۔ شادی کی تیاری شروع ہوئی۔ خاندان میں ایک یہی پھونسڑا باقی رہ گیا تھا۔ والد مر چکے تھے۔ ماں کی خوشی تھی کہ پرانی دیگ میں جتنی کُھرچن ہے سب بیٹی کی رکابی میں بھر دیں۔ کس کی رہی ہے کس کی رہے گی۔ فقط نام رہ جائے گا۔ منگنی ہوئی تو اکیس من مٹھائی اِدھر سے آئی اور اکیس من ہی اُدھر سے ملا کر بانٹی گئی۔ یہ شب برات کا چاند تھا۔ عید کی ستائیس تاریخ ساچق آئی تھی مگر مہمانوں کا تانتا ابھی سے لگ گیا۔ بیسیوں مغلانیاں بیٹھ گیئں۔ کپڑوں کے تھان پر تھان آ رہے ہیں۔ بزازہ کھلا ہُوا ہے۔ دو سی رہی ہیں تو چار ان میں ٹنکائی کر رہی ہیں۔ کوئی پاجاموں پر کیکری، سلمہ، ستارے کا کام کر رہی ہے تو کوئی دوپٹوں پر ماہی پشت کا جال بنا رہی ہے۔ باہر زردوز، قلعی گر، سنار، سادہ کار، جڑیئے میناکار، جلاساز بیٹھے ہیں شہر بھر میں دھوم مچ گئی کہ منجھلی بیگم کے ہاں غدار کھے شادی ہے شب برات آئی، حلووں کے تھال۔ آتش بازی کے ٹوکرے۔ میووں کی سینیاں زردے کی دیگیں چلی جاتی اور چلی آتی ہیں۔ رمضان آیا۔ افطاریاں آنے جانے لگیں عید ہوئی جوڑے بٹے عیدیاں گیئں اور آئیں۔ ہزاروں روپیہ اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر ہو گیا۔ اتنے میں شادی کی تاریخ آ پہنچی۔ ڈیوڑھی پر روشن چوکی والے آ بیٹھے نوبت رکھی ہوئی ہے۔ نفیریاں بج رہی ہیں۔ اندر ڈومنیوں کے طائفے پر طائفے چلے آتے ہیں۔ ایک

گہما گہمی ہے، آٹھ دن پہلے دلہن مائیوں بیٹھی۔ رت جگے ہونے لگے۔ آخر برات کا دن آیا۔ دولہا کا جلوس اللہ اکبر۔ دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ اس سے پہلے قلعہ کی آبادی میں بھی ایسی شاندار برات آنکھوں سے نہیں دیکھی تھی۔ بہن ایک بڑی کہانی ہے اور رات کم کہاں تک کہوں۔ وہ سماں بھلاتی ہوں اور بھولتا نہیں۔ اس وقت کو یاد کرکے میرا کلیجہ کانپنے لگتا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ خوب چیخیں مار کر روؤں۔ ہائے خدا کسی کو ایسا منحوس دن نہ دکھائے۔ نکاح ہو چکا اور دولہا میاں عُلسرا میں چلے۔ ڈیوڑھی میں کھڑے تھے۔ بہنیں اُچھل اُچھل کر آنچل ڈال رہی تھیں کہ پاؤں پر کوئی چیز رینگتی ہوئی معلوم ہوئی۔ پرانی طرز کے مکانوں کی ڈیوڑھیاں اوّل تو اندھیری ہوتی ہیں پھر بچّوں کی کُلبلُل، لڑکیوں اور ماما اصیلوں کا ہجوم سب دولہا کو گھیرے ہوئے کیونکر کوئی دیکھتا کہ کیا ہے۔ دولہا نے گھبرا کر ایک دو مرتبہ پاؤں جھٹکا۔

افوّہ! اللہ بُری گھڑی سے بچائے۔ بیوی خدا جانے کہاں سے سانپ آگیا تھا۔ میں تو کہتی ہوں سانپ کے روپ میں قضا تھی۔ پاؤں اُس کی دُم پر جا پڑا اور اُس نے پلٹ کر چُٹک لیا۔ چٹکنا تھا کہ دولہا میاں کے منہ پر زردی کھنڈ گئی۔ اتنا تو زبان سے کہا کہ سانپ نے کاٹ کھایا پھر ہوش نہ رہے۔ غل مچ گیا۔ مردوں کو خبر ہوئی تو وہ دوڑے ہوئے آئے۔ اندر کیا لاتے مردانے میں لے گئے۔ ملّا سیانے، پڑھنت پڑھنے والے بیسیوں نے اپنی اپنی کاریگریاں دکھائیں مگر بیچارے کو ہوش نہ آیا نیلا ہوتا چلا گیا۔ شام ہوتے ہوتے خاتمہ تھا۔ دلہن سہاگ کے جوڑے میں رانڈ ہو گئی۔ دولہا میاں قبر کے چھپر کھٹ میں جا سوئے۔ سہرے کی کلیاں خاک میں جا کر رکھ لیں۔

دولہا والوں کے ہاں جو کہرام مچا ہوگا مچا ہوگا۔ دلہن والوں کے گھر میں قیامت کا سماں تھا۔ منجھلی بیگم تو اسی وقت سے ایسی دھم ہو کر کوٹھڑی میں گھُسیں کہ ان کا جنازہ ہی نکلا۔ دلہن

حجلۂ عروسی میں وہ دن تو چپکی پڑی رہیں تیسرے روز جب ان کی ماں کی میّت نکل رہی تھی نکلیں تو دل اُلٹا ہوا تھا۔ گھر سے نکل کھڑی ہوئیں۔ وہ دن اور آج کا دن۔ انہیں کچھ خبر نہ تھی کہ کون ہوں اور کیا کہتی ہوں۔ جیتے جی سہاگن بننے کی دُھن اور دولہا کی رٹ لگی رہی۔ شروع شروع میں تو کئی کئی ہفتے غائب رہتیں۔ معلوم نہیں کہاں جاتیں اور رات کہاں بسر ہوتی۔ لوگوں نے کبھی کبھی انہیں قبرستان میں دیکھا۔ اس کے بعد ایک روز ہمارے ہاں آنکلیں۔ ہم انہیں پہچانتے تھے۔ ہم نے ان کی بہت خاطر کی۔ نجانے انہوں نے بھی ہمیں پہچانا یا نہیں۔ لیکن ہمارے ساتھ رہنے لگیں۔ دن بھر پھرتیں اور رات کو آجاتیں۔ بس بی یہ ان کا قصّہ ہے"

انہوں نے وہ واقعہ جو ناناجان سے سُنا تھا دُہرایا اور کہا کہ میں بیگم صاحبہ کے اسی ملازم کی وہی بیٹی ہوں جس کی شادی کے لیے انہوں نے اپنے دوپٹے کے دو مٹھی موتی دیے تھے۔ ہم ان کے قدیمی نمک خوار ہیں۔ ان ہی کی بدولت آج ہمیں رہنے کو یہ ٹھیکرا اور کھانے کو روٹی میسّر ہے۔ اللہ ان کو کروٹ کروٹ جنّت نصیب کرے۔

٭

ماسٹر ققنس

نام تو ہمایوں بخت تھا لیکن مشہور تھے ماسٹر ققنس۔ غدر کے بعد قلعے سے نکلے ہوئے شہزادوں کو اپنے بچوں کو پڑھانے کا خیال آیا تو صاحبِ عالم مرزا سلیمان شاہ نے شہزادہ اسکول کے نام سے چاندنی محل میں اپنا ایک مدرسہ کھولا تو اپنی قوم کی پرورش کے خیال سے شہزادوں ہی میں اکثر ماسٹر بھی بنائے گئے۔

شہزادے اور لکھنا پڑھنا۔ بچوں کے طبلے بجتے، ٹھمریاں اڑتیں، بازیوں کے ذکر ہوتے۔ ماسٹر ققنس اپنے جتھے میں سب سے زیادہ نرالی شکل وصورت کے آدمی تھے جسم کے قاق، لمبا قد، بڑی ناک، چگی ڈاڑھی، اوپر کا دھما بڑا، نیچے کا چھوٹا، ناک سے ستار بجانے میں انہیں کمال حاصل تھا۔ دونوں نتھنوں پر انگلیاں رکھ کر جس وقت گتیں نکالتے بالکل یہ معلوم ہوتا کہ ستار بج رہا ہے۔ اس لیے شاگردوں نے ان پر ققنس کی پھبتی کہی اور یہ پھبتی ایسی پھلی پھولی کہ شہر میں سب ققنس اور پھر ققنس سے ماسٹر ققنس کہنے لگے۔

شہزادوں کی زبان کا کیا کہنا۔ طبیعتیں براق، ذہن جوہردار، دماغ فراٹے بھرتا ہوا، بے باکی اور آزادی، پھبتیاں ان کے گھر کی لونڈی، ذومعنی فقرے کسنے میں یہ استاد۔ گفتگو کیا بارہ مسالے کی چاٹ ہوتی ہے۔ پھر اُن میں ماسٹر ققنس کا نمبر اوّل تھا۔ ان کے پاس بیٹھ کر کھانے پینے کا کچھ ہوش نہیں رہتا تھا۔ کوئی پینتالیس برس ہوئے جب انہیں دیکھا تو بوڑھے ہوگئے تھے جیسے گھڑایا ہوا چھوارہ مگر دل جوان تھا۔ کیا مجال جو باتوں میں فرق آیا ہو۔

میری ان کی جان پہچان کی شانِ نزول یہ ہے کہ ایک دن میرا چاندنی محل میں گذر ہوا۔ ایک دوست مل گئے۔ وہ کہیں جا رہے تھے۔ پوچھا "کہاں کا ارادہ ہے؟" بولے "کہیں نہیں۔ گھر میں بیٹھے بیٹھے جی گھبرایا۔ میں نے کہا کہ ذرا ماسٹر ققنس کے ہی پاس چل کر دل بہلا آؤں۔" ماسٹر ققنس کا نام تو میں نے سُنا تھا۔ دیکھنے کی آرزو تھی۔ کہنے لگے کوئی کام نہ ہو تو تم بھی چلو۔ ان کی باتیں سن کر یہ سمجھو گے کہ قہقہہ دیوار کے کھنڈر میں آگئے

غرض کہ ہم دونوں چلے۔ دلّی دروازے پہنچے۔ دریا گنج کی طرف کی فصیل پر چڑھ گئے دیکھا کہ پیپل کے درخت کے نیچے پانچ سات کارخانے دار قسم کے لوگ بیٹھے ہیں اور ماسٹر ققنس کی زبان قینچی کی طرح چل رہی ہے۔ صاحب سلامت کر کے ہم بھی ایک طرف جا بیٹھے۔ اتنے میں ایک شاگرد بولے۔

"صاحب عالم! آج کون سی کتاب پڑھائیے گا؟"

دوسرا شاگرد: ہائیں، صاحب عالم، ماسٹر ققنس کہو۔ ہتک کرتے ہو۔

ماسٹر: ارے بھئی ققنس تو بغیر انڈا دیے ہی پر جھاڑ کر راکھ ہو گیا۔ اب اگر کہتے ہو تو خالی ماسٹر ہو۔

شاگرد: واہ حضت وا۔ یہ خوب کہی۔ انڈوں کی کیا کمی۔

دوسرا شاگرد: خدا کی شان تو دیکھو کہ کھچڑی گنجی کھٹکتے ہی انڈا
حضورِ بلبلِ بستاں کرے نواسنجی نکال کر جھنڈا

ماسٹر: شاعری کی ابھی سند نہیں۔ پہلے ایک آدھ سبق ہو جائے۔

شاگرد: بہت اچھا۔ پھر کیا نکالیں تاریخ، جغرافیہ؟

دوسرا شاگرد: آج تو جی چاہتا ہے کہ گھر بیٹھے جہانیاں جہاں گشت بن جائیں۔

ماسٹر: بسم اللہ

شاگرد: میں معلوم کرنا چاہتا ہوں یہ جو شہروں پہاڑوں وغیرہ کے نام ہیں ان کے معنی کا بھی آپ کو علم ہے۔

ماسٹر: نہ ہونے کے کیا معنی؟ وغیرہ تک کے معنی یہاں ازبر ہیں۔

دوسرا شاگرد: ہم تو جہاں گئے۔ جس پہاڑ پر چڑھے۔ اس کی سرحد میں داخل ہونے سے پہلے نام کی پڑتال۔ کئی کئی دن باہر پڑے رہے۔ سوچتے سوچتے عقل چکرا گئی۔ سر پھرکی بن گیا۔ دل نے یہی جواب دیا کہ سمجھے اور پتھر کے ہوئے۔ لوٹ جاؤ۔ اس لیے بیسیوں شہروں پر چڑھائی کرتے کرتے لوٹ آئے کہ ان جانے، بے سمجھے بوجھے شہر میں کون جائے۔

ماسٹر: بہت اچھا کیا۔ علم کو تم نے کیا دو ٹکے جان کی استانی سمجھ لیا ہے۔ بھیا! دریں ورطہ کشتی فرو شد ہزار۔ استاد تان رس خاں بھی اس میں عمر بھر چٹے ٹوئیاں مارتے رہے یہ تو میرا ہی جامہ ہے کہ لکڑی پھٹے یا رہے چول بٹھا دیتا ہوں۔ اگرچہ معنی نہ بھی ہوں تو زبردستی پہنا دوں۔ آخر یہ چیزیں خدا کے ہاں سے تو نام لے کر اتری نہیں۔ لوگوں ہی نے نام رکھے ہیں لو اب تم شروع کرو۔ یہاں زبان میں کھجلی ہونے لگی ہے۔

شاگرد: تو بتائیے نینی تال۔

ماسٹر: پہاڑ ہے۔ گرمیوں میں جمنا پار والے وہاں ٹھنڈے ہونے کو جاتے ہیں۔

شاگرد: پہاڑ اور نام نینی تال۔ واہ رے زمانے کی اونچ نیچ۔ عقل گیند[۱] چڑی۔ سمجھ بوجھ گُچھی[۲] پالا۔ اور فہم و وقوف گلی ڈنڈا[۳] کھیلتا پھرے یا نہیں۔

---

[۱]، [۲]، [۳] تینوں قدیم کھیلوں کے نام ہیں۔

ماسٹر: چہ خوش! شہروں کے نام اور ان کے معنی پوچھتے تھے یا جا پہنچے عرش کی سیڑھیوں پر۔ مجھے ڈر ہے کہ دشمنوں کو اُچک دم کی بیماری نہ ہو جائے۔ نینی تال سے شملہ۔ شملہ سے دارجلنگ۔ دارجلنگ سے آبو۔ آبو سے ہمالہ۔ چوٹی چوٹی کودنے لگے۔

شاگرد: یہ بھی سب پہاڑ ہیں!

ماسٹر: اور کیا قطب صاحب کی لاٹھ یا ہمایوں کا مقبرہ!

شاگرد: لا نا ہا ہا۔ کیا فرّاٹے بھرے ہیں۔ خوب یاد دلا دیئے ورنہ مجھے بیچے کر کے نکالنے پڑتے، مگر استاد یہ آپ نے کیا کہا کہ یہ سب پہاڑ ہیں؟ پہاڑ کا نام پہاڑ ہوتا ہے یا شملہ ٹپکہ، آبو یا بو۔

ماسٹر: دریا کا نام کیوں نہیں رکھا۔ گنگا، جمنا، گومتی، گھاگھرا کہتے ہو یا نہیں اس طرح ان پہاڑوں کے نام بھی ہیں۔

شاگرد: (کان پکڑ کر) توبہ توبہ کیسی چوک کھائی ہے۔ لاحول ولا۔ اچھا نینی تال پہاڑ ہے تو اس کا نام نینی تال کیوں ہوا؟

ماسٹر: اس میں اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ ایک عورت آنکھ سے کانڑی بڑی دھیں دھونگڑ تھی۔ نینی اس کا نام تھا۔ اس اکیلی نے پہاڑ میں ایک تالاب بنایا۔ آس پاس کے لوگ نینی کا تال کہنے لگے۔ پھر نینی تال ہو گیا۔

ایک قصّہ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ عوج بن عنق کے زمانے میں اس ٹیلے پر ایک کانا دیو رہتا تھا۔ ایک دفعہ اس پر بجلی گری، وہ مر گیا۔ اس کی پھوٹی آنکھ کا گڑھا اتنا بڑا تھا کہ مینہ کا پانی جو اس میں بھرا تو تالاب سا نظر آنے لگا۔ آس پاس کے دیہاتی اس کی لاش دیکھنے آئے تو حیران۔ اتنی دیر میں مچھلیاں پیدا ہو گئی تھیں۔ وہ ایک دوسرے

سے کہتے کہ دیکھو دیو کی نین تال کے برابر ہے۔

مورخ یہ بھی لکھتے ہیں کہ اس سرزمین کا زمین دار تالا چند نامی بڑا خوبصورت تھا کوئی جادوگرنی نین بتی اس پر عاشق ہو گئی اس نے جادو کے زور سے یہ پہاڑ بنایا اور پہاڑ میں تالاب۔ دن بھر وہ سیر سپاٹوں میں پھرتے اور رات کو دونوں تالاب میں رہتے جادو کا کھیل تم جانو بُرا ہی ہوتا ہے۔ ایک دفعہ جو گئے، نہ جانے کیا بجوگ پڑا پھر نہ اُبھرے۔ یار لوگ "نین بتی تالا چند" کہنے لگے جس کا مخفف ہو کر نینی تال رہ گیا۔ آگے خدا جانے۔

شاگرد: لکھتم کے آگے بکتم کی نہیں چلتی۔ جو بڑے لکھ گئے ہیں سچ ہی ہو گا۔

ماسٹر: اب شملے کو لو۔ کہتے ہیں کہ حضرت آدمؑ سے پہلے یہاں ایک سنبھل کا درخت تھا۔ ایسا عظیم الشان کہ پھننگ چوتھے آسمان پر۔ جڑ ساتویں طبق زمین میں شاخیں پورب، پچھم، اُتر، دکن چاروں طرف پھیلی ہوئی تھیں۔ حضرت نوحؑ کے وقت میں جب طوفان آیا تو جہان بھر کے طوطے اس پر آکے چھپے۔ اسی وجہ سے طوطوں کی نسل باقی رہی اور اسی سبب سے طوطوں کو سنبھل کے درخت سے لگاؤ ہے۔ طوطوں کی بولی میں پہلے یہ سنبھلا کہلایا پھر شین کا تشتاک ہو کر شملہ بن گیا۔

شاگرد: اور آبو؟

ماسٹر: یہ حکیم الو صاحب کی اپچ ہے۔ فرماتے تھے کوئی چمار مر کر بھتنا بن گیا اس کی ایک بہن تھی۔ وہ راتوں کو اپنی بہن کو آبوا آبوا کہہ کر پکارا کرتا تھا۔ لوگوں نے جگہ کا نام آبوا رکھ لیا۔ پھر آبوا سے آبو کہنے لگے۔

شاگرد: دار جلنگ کی وجہ تسمیہ ارشاد ہو۔

ماسٹر: سنو! ایک پولیس جمعدار کسی غریب عورت کا جھلنگا چھین لایا۔ وہ جمعدار جھلنگا، جمعدار جھلنگا کہتی دوڑی۔ یہ کب دینے والے اسامی تھے۔ آخر چیختے چیختے اسے سودا ہو گیا۔ دیوانہ پن کی حالت میں جمعدار جھلنگا ہی کی رٹ آٹھوں پہر لگائے رہتی تھی بعد مدّت جب وہ جہنّم واصل ہوئی تو یاروں نے جمع غائب کر کے دار جھلنگا کہنا شروع کر دیا۔ انگریز تم جانو جھلنگا کیا سمجھیں۔ انہوں نے دار جلنگ بنا لیا۔

شاگرد: اچھا ہمالہ؟

ماسٹر: یہ کتابت کی غلطی ہے۔ ہائے ہوّز سے لکھ کر انہوں نے دنیا کو مغالطے میں ڈال دیا۔ اس کا نام حمّالہ تھا۔

شاگرد: حمّالہ کیا؟

ماسٹر: ارے میاں وہی حمّالہ بکاؤلی پری کی داروغہ دیلونی۔ یہ اس کی حویلی کا پشتہ ہے۔ مکان کھنڈر ہو گیا اور ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

شاگرد: بس بس قبلہ۔ اب اور کو رہنے دیجئے۔ آپ کا تو بہرہ کھل گیا۔ لگے پہاڑوں کی جڑ بنیاد کھودنے۔ اب ذرا نیچے آئیے۔ آپ اوُپر کی ہوا کھاتے رہے تو نیچے شہر اندھیرے میں رہ جائیں گے۔ ذرا انگریزوں کے پُرانے دارالسلطنت کلکتّہ کے تو معنی فرمائیے۔

ماسٹر: یاران گل فروش اس کی وجہ تسمیہ گُل گھٹّا یعنی پھولوں کا ڈھیر یا گُل گتھّا۔ یعنی یہ شہر کیا ہے۔ پھولوں سے گتھّا ہوا ہے۔ جلاہوں کی روایت میں کل کاتا مطلب یہ کہ یہاں سوت کل سے کاتا جاتا ہے۔ اہلِ لکھنؤ کے عقیدے میں کال کاٹا۔ یعنی جو وہاں گیا اوّل تو مر ہی گیا نہیں تو کوئی نہ کوئی بیماری لے کر بھاگا۔ داغ ضرور لگا لایا۔ ان کی

نوابی تک کا وہی قبرستان بنا۔

بعض جلے تنوں کا قول ہے کہ ایک مفلس کھل اپاڑ، اور کسی حلال زادے کے لوٹ کی تکرار ہو گئی۔ ایک پیسے کے لین دین کا معاملہ تھا آخر کھل اپاڑ نے کہا یا پیسہ دے یا میں پیسہ بھر تیری بوٹی کاٹ لوں گا۔ وہاں چمڑی جائے تو بلا سے دمڑی نہ جائے بولا کاٹ لے۔ چنانچہ اس نے پیسہ برابر کھال کاٹ لی اور اسی دن سے جس جگہ پر یہ واقعہ ہؤا تھا وہ 'کھال کاٹا' مشہور ہو گئی۔

کتھک اپنی الگ ہی گاتے ہیں۔ ان کی راگ مالا میں لکھا ہے کہ ہرگاس کتھک کوئی راجہ تھا۔ راجہ اندر کے زمانے میں کُل کتھک یہیں رہتے تھے وقت کی اُلٹ پلٹ میں ملک بھی چھن گیا اور کتھکوں کی طرح کتھک کا حرفِ شناخت یعنی کاف آخر کو بھی نکال لیا۔ مجھے یقین ہے کہ یہ قطعی کلکتہ کی وجہ تسمیہ ہو گی۔ اس لیے کہ اس نام میں تھرک اب بھی موجود ہے۔

شاگرد: آپ تو ایک ہی مقام پر گتیں بھرنے لگے۔ اچھا بتائیے بمبئی؟

ماسٹر: کیا خوب! ایک ہی توڑے میں سمندر کے اِس کنارے سے اُس کنارے پر۔

شاگرد: اور کیا گھٹنیوں چلتے۔ ہاں جناب بمبئی!

ماسٹر: غلط! اسے کہتے ہیں "بام بے" اب کچھ کرید کی حاجت نہیں رہی۔ وہاں بمبوں سے پانی لیا جاتا ہے۔ سب بمبوں کا پانی پیتے ہیں۔ گلی گلی، گھر گھر، کوٹھے کوٹھے، ماڑی ماڑی یہاں تک پاخانوں کی جگہ بھی دیکھئے تو ایک بمبا لگا ہؤا ہے۔ اس کا پوچھنا کیا۔ الم نشرح ہے کہ وہاں زندگی کا سہارا صرف بمبے ہیں۔ اب رہیں

پُرانی باتیں۔ کسی زمانے میں یہاں ایک دو موُنہی سانپن کی بانبی تھی۔ جب آبادی ہُوئی تو لوگوں نے 'بانبی' ہی اس کا نام رکھ دیا، جو زبانوں پر چڑھتے اُترتے بمبئی ہو گیا۔

شاگرد : ستارہ ؟

ماسٹر : پہلے پہل ستارے یہیں بنائے گئے تھے۔ آگے چلو

شاگرد : میسور ؟

ماسٹر : اس میں کیا دقت ہے 'مے سور'۔ جہاں شراب ہو گی وہاں اس کے ساتھ کی چیز بھی ہونی چاہیئے۔ وہ تو برخوردار خدا کے ہاں سے جوڑا ہی اُترا ہے۔

شاگرد : مدراس ؟

ماسٹر : 'مے سور' کے بعد بھی مدراس کو نہیں سمجھے ؟ مدھ ماتے بھی سُنا ہے ؟ مدھ وہاں کے لوگوں کو راس آگئی تھی۔ اس لیے یاروں نے مدھ راس رکھ لیا۔ پھر ہمّت کی ہ گر پڑی۔ خالی مدراس رہ گیا۔

شاگرد : اور یہ پشاور ؟

ماسٹر : کھلی ہوئی بات ہے۔ یہاں اہلِ حرفہ رہتے تھے۔ اسی وجہ سے پیشہ ور نام پڑ گیا۔

شاگرد : لاہور کے کیا معنی ہوئے ؟

ماسٹر : کیا آدمی ہو۔ ارے میاں یہاں کا زمیندار بڑا لالچی تھا۔ جب اپنی اسامیوں سے لگان وصول کرنے جاتا یہی کہتا رہتا 'لا ہور' 'لا ہور' یعنی لا اور۔ اب کچھ اور پوچھو۔

شاگرد : اب کے وہ نام پوچھوں کہ آپ بھی تھرا جائیں۔ آئیے میدان میں۔ فرمائیے یہ امّ الاشہار، سلطان الدیار حضرت بی بی دہلی صاحبہ شریفہ مرحومہ کی کیا جڑ بنیاد ہے ؟

ماسٹر: شاباش! آؤ تو میرے پاس، ذرا کمر ٹھونکوں۔ کس ادب قاعدے سے نام لیا ہے کہ سارے مقبروں کی روحیں خوش ہو گئی ہوں گی۔ بھائی اُمّ الاشتہار کیا اسے تو ملکہ زمانی اور سلطانِ جہانی کہنا روا ہے۔ لیکن رہی یہ ہمیشہ رنڈیا دُکھیا۔ دو دن سہاگن تو دو چار روز بہاگن۔ ہم تو آج تک اس کی جان کو روتے ہیں۔

شاگرد: اجی آنسو نہ بہائیے۔ بے چاری مرحومہ ہو گئی تو اس میں اس کا کیا قصور۔ اس نے بھی تو کسی کالے سر اور سفید منہ والے کو نہیں چھوڑا۔ جسے غافل دیکھا جھٹ جمنا میں غوطہ دے دیا۔

ماسٹر: لو اب تم واسوخت نہ پڑھو۔ اس کی اصل نسل پوچھو۔

شاگرد: بتائیے!

ماسٹر: سُنو! تاریخی کہانیاں تو میں سُناؤں گا نہیں۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ ہمیں جو اپنے بزرگوں سے سینہ بہ سینہ پہنچا ہے یہ ہے کہ دراصل دہلی کہتے ہیں چوکھٹ کو۔ اس شہر کی بنیاد سے پہلے دروازوں میں چوکھٹ کا دستور نہ تھا۔ یہیں سے یہ بات ایجاد ہوئی۔ دوسری روایت یہ ہے کہ ابتدائے آفرینش سے آج تک اس سرزمین پر دس دھاڑے گھن گرج ہوئے۔ اس لیے 'دوہلتے' نام پڑا۔ اب دو حرف قریب المخرج رہتے کیوں کر ایک جھپیٹ ہوا۔ رہی یائے مجہول و معروف۔ یہ لکھنے والوں سے پوچھو۔ تیسرے اکثر پُرانے گنبدوں میں جا کر یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ ایک مرتبہ غنیم نے رات کے وقت سُرنگ لگا کر جو اڑائی تو اس کی آواز سے لوگ دہل گئے اور گھر گھر عورتیں دہلی دہلی کہنے لگیں۔ چوتھے بالائی بات یہ بھی مشہور ہے کہ خسرو پرویز کے زمانے میں بی بی شیریں کا گاؤخانہ یہیں تھا۔ دودھیلے جانور بہ کثرت۔ دودھ کی وہ افراط کہ کبھی کبھی جمنا میں بہانا پڑتا۔ حکم

آیا کہ دہی جما لو اور گھی نکالو۔ دودھ جمنے اور مسکہ نکلنے لگا۔ اب جو دہی بلونے سے بچ جاتا تو شہر میں بکتا اور صبح سے دوپہر تک گلی گلی، کوچے کوچے گوالنیں "دہی لے دہی لے" چلاتی پھرتیں۔ اسی 'دہی لے' نے وہ زور پکڑا کہ بستی کا نام ہی 'دہی لے' مشہور ہو گیا اور 'دہی لے' سے دہلی بن جانا کوئی مشکل نہ تھا۔ آگے علم خدا کو۔

اتنے میں بارہ بجے کی توپ چلی 'دنا نانا'۔ ماسٹر قفنس بولے: "لو بھئی! اچھٹی کا گھنٹہ بج گیا۔ چلو۔"

شاگرد: بس ایک بات اور بتا دیجئے۔ ہمارے ماموں خواجہ بلند شہر بہت جایا کرتے تھے۔ یہ خواجہ کیا؟ پھر بلند شہر بھی ساتھ لگا ہوا ہے۔ اس کے کیا معنی؟

ماسٹر: دو قدم کا حال بھی معلوم نہیں۔ دہلی کے بادشاہ کا خوجہ بلند خاں بڑا لم ڈھیک بلّی کی بلّی تھا۔ یہ شہر اسی کا آباد کیا ہوا ہے۔ مدتوں خوجہ بلند کا شہر کہلایا۔ اس کے بعد لوگ خواجہ بلند شہر کہنے لگے۔

تھیں تو یہ سب چٹکیں لیکن دیکھیے کیا جوڑ ملاتے ہیں۔ میں ان کی بے تکلف اور بے تکان آمد پر حیران تھا۔ طرز ادا اس قدر دلچسپ تھی کہ آج تک ویسی مٹھاس کسی کی باتوں میں نہیں پائی۔ افسوس دو مرتبہ کے سوا مجھے ان کے پاس بیٹھنا اور ان کے عجیب و غریب علم سے لذت یاب ہونا نصیب نہیں ہوا۔ یہ لوگ دلّی کے آثار قدیمہ میں سے تھے۔ کڑوے تیل کا چراغ جس کا دھواں بھی آنکھوں کو قوت دیتا تھا۔ کیا کیجئے تم نے ان کی قدر نہ کی۔ بجلی کے قمقموں سے آنکھیں سینک سینک کر اپنے تیور جلانے لگے۔ انہیں اٹھا کر اندھیری کوٹھڑیوں میں ڈال دیا۔ آخر وہ بھی ناراض ہو گئے۔ ان کا ٹھکانہ کلو مخشو کا تکیہ تھا، وہاں جا کر سو رہے۔

نانی بستی

خدا بخشے نانی بستی کو، ایسی جنت کی حوروں کو مات کرنے والی بیویاں اب کہاں ۔ کیا نورانی شکل تھی۔ اور کیسی بھولی بھالی باتیں سٹر بلّی سَتری بہتری نہیں کہ اوٹ پٹانگ بولیں یا چوہے کو بلّی اور بلی کو چوہا بنائیں۔ گھر والوں پاس پڑوسیوں کی ہنسی کا کھلونا ہوں سگھڑاپا ان کا سا کسی میں ہو تو لے۔ کھانے پکانے میں ایسا سلیقہ کہ باورچی اور رکابدار مات۔ گھر کی جو چیز ہے اپنے ٹھکانے پر۔ انگنائی دیکھو تو چندن سی۔ دالانوں میں ہر وقت اُجلا فرش۔ لوگ کہتے ہیں کہ روپ کی روئے اور کرم کی سیجوں پر سوئے۔ یہاں خدا نے روپ بھی دیا تھا اور کرم بھی۔ بات یہ ہے کہ عورت کی تقدیر سلیقے میں ہوتی ہے آج تک جوانی سے بڑھاپا آگیا۔ میاں بیوی کی کھٹ پٹ کسی نے نہ سُنی۔ خاں صاحب جیسا جلاتن آدمی سدا بیوی کا دم بھرتا رہا۔ یہ بھی نہیں کہ نگوڑی نانٹھی تھیں۔ ماشاءاللہ چھ بیٹیاں اور ایک بیٹا۔ سب ایک سے ایک تمیز دار۔ دیکھنے والے ان کے قاعدے قرینے دیکھ کر حیران ہوتے کہ اِدھر خاں صاحب مزاج کے ایسے کڑوے اُدھر نانی بستی دنیا کی باتوں سے بے خبر۔ اور بچے ایسے جیسے جنتر میں سے تار کھنچے چلے جاتے ہیں۔ مجال کیا کہ کوئی بے طور اُٹھا ہو۔ ہاں آج کل جیسی تین پانچ کسی میں نہ تھی۔

خاں صاحب جھلّے اور مزاج کے کھرّے ضرور تھے۔ مگر پکّے مسلمان نیّت کے صاف۔ دل میں سب کا درد رکھنے والے۔ محلّے بھر کے خدمتی بیواؤں یتیموں کے خبر گیر۔

جمعہ کے جمعہ عزیزوں، رشتہ داروں کے ہاں جاتے۔ ہر ایک کے دُکھ درد میں جھک پڑتے۔ شہر کے ایک رئیس کے ہاں مختار عام تھے۔ تنخواہ تو چالیس پچاس سے زیادہ نہ تھی وہ وقت ہی ایسا تھا ہر چیز سستی اس زمانے کے سے تکلفات نہ تھے۔ بڑے آرام چین سے گذر ہوتی۔ لیکن افسوس ان کی عمر نے زیادہ دفا نہ کی۔ صرف ایک لڑکی کا بیاہ کرنے پائے تھے کہ یکایک موت آگئی۔ دوسری لڑکیوں کے بیاہ اور بیٹے کے سہرے کی بہار دیکھنے کا ارمان دل کا دل ہی میں لے گئے۔

لوگ سمجھتے تھے کہ خاں صاحب کے بعد نانی بستی اس بھولے پن کے ساتھ کس طرح زندگی بسر کر سکتی ہیں۔ لڑکیوں کو کہاں بر ملیں گے۔ لیکن یہ خبر ہی نہیں کہ دنیا میں اگر عقلمند اور ہوشیار ہی نصیب والے ہوتے تو بے چارے سیدھے سادے بیوقوف کیونکر زندہ رہتے۔ انہیں کوئی پوچھتا نہیں۔ خدا کی کریمی کے قربان، رئیس نے خاں صاحب کی تنخواہ نانی بستی کے نام کر دی۔ لڑکیوں کے گھر بیٹھے رقعے آنے لگے۔ دو برس کے اندر اندر سب کی تقدیریں کُھل گئیں اور بیٹیاں ہی اپنے اپنے گھر کی نہیں ہوئیں بیٹے کی چاند سی دلہن آگئی۔

نانی بستی کی سگی چھوٹی بہن میرٹھ میں بیاہی ہوئی تھیں۔ خاں صاحب کی زندگی میں ایک مرتبہ ان کا میرٹھ جانا ہوا تھا تو اونٹ گاڑی یا گھوڑوں کی تِکرم میں ایک روز بیٹھے بیٹھے انہوں نے بیٹے سے کہا کہ بیٹا انجم کو دیکھے برسوں ہو گئے ہیں۔ شادیوں میں بلایا تو نہ گئی جانے کیسی ہے۔ جی چاہتا ہے اسے دیکھ آؤں۔ تمہارے ابا خدا بخشے اب زندہ نہیں کہ اچھی طرح پردے کا انتظام کر کے لے جائیں۔ تم تِکرم میں بٹھا کر پہنچا دو۔ اونٹ گاڑی موئی تو مجھے کاٹنے کو دوڑتی ہے۔ بیٹا بولا جب آپ حکم دیں اور تِکرم یا اُونٹ گاڑی میں

بیٹھنے کی کیا ضرورت ہے میں آپ کو دھوئیں کی گاڑی میں لے چلوں گا۔ ریل ان دنوں شروع شروع جاری ہوئی تھی اور عام طور سے اسے دھوئیں کی گاڑی کہتے تھے۔

نانی بستی نے حیران ہو کر پوچھا۔ "اوئی بھئی یہ دھوئیں کی گاڑی کیسی ؟ کیا اس کے اندر چولہے سُلگتے ہیں ؟ نہیں میاں میری تو آنکھیں پھوٹ جائیں گی۔ پہلے ہی مجھے کم سوجھنے لگا ہے۔ اندھا کرنا ہے تو ویسے کہہ دو۔" بیٹے نے ریل کی حالت سمجھا بجھا کر بتائی اور کہا "کہ اس کے آنے جانے کے وقت مقرر ہیں۔ میں آج اسٹیشن پر جا کر اس کے چلنے کا وقت پوچھ آؤں تو کل میرٹھ چلے چلیں گے۔"

نانی بستی: یہ اسٹیشن کیا بلا ہے ؟ کیا ریل کا اڈا نہیں ہوتا۔

بیٹا: اماں جان ریل کے اڈے کو اسٹیشن کہتے ہیں۔ جب چلو گی تو دیکھ لینا۔ بہت بڑا مکان بنا ہوا ہے۔ وہاں ریل گاڑی کھڑی رہتی ہے۔

نانی بستی: مجھے آگے کی طرف نہ بٹھانا۔ ایک دفعہ اونٹ گاڑی میں تمہارے باوا نے آگے دار کو بٹھا دیا تھا۔ کمبخت نے سڑا دیا۔

بیٹا: ارے بی ریل میں اونٹ تھوڑی جُتتے ہیں۔

نانی بستی: وہاں تو گھوڑے لگتے ہوں گے۔ وہ نگوڑے اونٹ سے بدتر۔ ان کی دُلتیوں کے دھماکے سے خدا بچائے۔

بیٹا: گھوڑے بھی ریل کو نہیں کھینچتے۔

نانی بستی: اوئی میاں تو کیا اُڑن کھٹولا ہے۔

بیٹا: اس کے چلنے کی ترکیب تو میں بھی نہیں جانتا۔ ہاں وہ دھوئیں پانی سے چلتی ہے۔ اور ایسے فرّاٹے بھرتی ہے کہ جی خوش ہو جاتا ہے۔

نانی بستی: خیر بھئی تمہیں اختیار ہے جس میں چاہے بٹھا کرلے چلو۔ اب تم سے کیا کہوں۔ مگر اتنا خیال رکھنا کہ بڑھاپے میں مٹی خراب نہ ہو۔ دوسرے دن صبح ہی صبح صاحبزادے اسٹیشن پر گئے اور دوڑے دوڑے آکر بولے۔ اماں جان میں گاڑی کا وقت پوچھ آیا ہوں۔ ٹھیک بارہ بجے جاتی ہے تیار ہو جاؤ۔ میں نے ڈولی کو کہہ دیا ہے۔

نانی بستی جلدی جلدی اپنی گٹھڑی مٹھڑی سنبھالنے لگیں۔ بستر باندھا۔ پاندان سجایا، لوٹا کٹورا لیا اتنے میں کہاروں نے آواز دی کہ ڈولی آگئی ہے۔ گھر والوں سے خوب بھینچ بھینچ کر گلے ملیں۔ روتے ہوئے سب کو رخصت کیا اللہ بیلی! اللہ نگہبان کہتی ہوئی ڈولی میں بیٹھیں۔ بیٹے نے گلی کے باہر سے اکہ کرایہ پر لیا۔ سارا سامان اس میں رکھ کر ڈولی کے ساتھ ساتھ چلنے کی تاکید کی اور بسم اللہ کرکے اسٹیشن پر چلے۔

جو پرانی وضع کے لوگ ہیں آج بھی اسٹیشن پر گھنٹوں پہلے پہنچ جاتے ہیں۔ یا ایسا ہوتا ہے کہ پہنچتے پہنچتے گاڑی چھوٹ گئی بیچاروں کو اتنی مدت میں بھی ریل کے اوقات کی پابندی کا خیال نہیں آتا۔ اسٹیشن پر جا کر یہ تماشے دیکھ لیجئے۔ دس بجے گاڑی جاتی ہے۔ صبح سے اسباب سنبھالے بیٹھے ہیں۔ یا گاڑی چل پڑی اور یہ منہ دیکھتے رہ گئے۔ تو سمجھ لیجئے اس زمانے میں اونٹ گاڑیوں میں سفر کرنے والوں کی کیا کیفیت ہوگی۔

نانی بستی کی ڈولی اسٹیشن پر پہنچ گئی۔ گاڑی کے روانہ ہونے میں ابھی ایک گھنٹہ تھا۔ ٹکٹ کی کھڑکی ابھی کھلی نہیں تھی۔ نانی بستی کے بیٹے بھی آخر نانی بستی کے بیٹے تھے۔ مرد ہونا اور بات ہے۔ تھے تو پرانے زمانے کے آدمی ریل میں سفر کرنے کا دو ایک ہی دفعہ اتفاق ہوا تھا۔ وہ بھی دوسروں کے ساتھ۔ اب وہ ٹکٹ کے لیے بولائے بولائے پھر رہے ہیں۔ کبھی ادھر جا کبھی اُدھر۔ اس سے پُوچھ اُس سے پوچھ ٹھیک جواب کون دے۔

جتنے مسافر تھے ان ہی جیسے۔ آخر گھنٹی بجی بابو نے آواز دی "ٹکٹ لینے والو چلو"۔ مسافر دوڑے۔ تو مجھ پہ اور میں تجھ پر۔ کھڑکی پہ دھکا پیل ہونے لگی۔ نانی بستی ڈولی میں بیٹھی بیٹھی مسافروں کی ہشت مشت دیکھ دیکھ کر جل تو جلال تو کی تسبیح پڑھ رہی ہیں۔ آخر بڑی کش مکش کے بعد مشکل حل ہوئی۔ ٹکٹ لے کر آئے۔ مزدور کے سر پہ اسباب رکھوایا کہاروں سے کہا لو بھئی اندر چلو"۔

ریل کا نیا نیا انتظام تھا۔ باقاعدہ قلی تھے نہ اتنے بابو۔ زنانی مردانی گاڑیوں کی بھی پوری پہچان نہ تھی۔ جہاں ریل کھڑی تھی کہاروں نے ڈولی تو رکھ دی مگر نانی بستی کو بٹھائیں کہاں سب گاڑیوں میں مرد گھسے جاتے ہیں۔ ان کی گھبراہٹ دیکھ کر گارڈ نے پوچھا۔ "ویل کیا مانگتا ہے؟" یہ بولے پردے والی سواری ہے کس جگہ بٹھاؤں"۔ گارڈ تو ایک خالی گاڑی بتا روانہ ہوا۔ انہوں نے ڈولی گاڑی کے برابر لگوا کر کہا " اماں جان لیجئے اس گاڑی کے اندر بیٹھئے۔ میں سامان رکھواتا ہوں"۔

مزدور اس ہاڑ تاڑ میں پیچھے رہ گیا تھا۔ پھر مسافروں کی ریل پیل۔ وہ الگ میاں کو ڈھونڈ رہا ہے اور میاں جدا" اب او مزدور ابے او مزدور کی آوازیں لگاتے دوڑتے پھر رہے ہیں۔ وہ تو ڈولی والوں کا خدا بھلا کرے۔ انہوں نے نانی بستی کا سامان پہچان لیا اور میاں کو بتا دیا۔ اب جو دیکھتے ہیں تو جس گاڑی میں اماں کو بٹھایا تھا وہ نہیں ملتی۔ ساری گاڑیاں یکساں آوازیں دیتے دیتے تھک گئے۔ نانی بستی کی سنتے۔ گاڑی میں جو گھسیں تو آدم نہ آدم زاد۔ کھڑکیاں بند ہکّا بکّا کھڑی ہیں۔ بیٹھنے کی جگہ ہو تو بیٹھیں۔ یا اللہ یہ گاڑی ہے کہ جانوروں کا پنجرا۔ اِدھر سلاخیں اُدھر سلاخیں کہاں بیٹھوں؟ بیچ پہ بیٹھتی ہوں تو بے پردگی کا ڈر۔ دروازے میں سے کسی مردوئے نے جھانکا تو کیا ہوگا۔ اُوپر

مچان پر چڑھیں کس طرح ؛ جوان ہوتیں تو اُچک کر جا بیٹھتیں ۔ بنچ کے نیچے جھانک کر دیکھا دل میں کہا " اچھا پردے والیوں کے بیٹھنے کی یہ جگہ ہے ۔ اے ہے اس سے تو ہمارے ہاں کی آپلوں کی کوٹھی لاکھ درجے اچھی ۔ کیوں کر بیٹھوں "؟ لیکن کرتی بھی کیا ۔ پردے کا خیال ۔ بہن سے ملنے جانا ضروری ۔ دوسرے اب تو آ پھنسی تھیں ۔ جوں توں کر کے بنچ کے نیچے بُرقع بچھا کر گُنڈلی مُنڈلی مار پڑ گئیں ۔

اتنے میں گارڈ نے سیٹی دی ۔ " بیٹھو بیٹھو دروازے بند کرو کی آوازیں پڑنے لگیں ۔ مزدور نے کہا " میاں کیا دیکھتے ہو جلدی سوار ہو گاڑی چھوٹنے والی ہے " ۔ سامنے والی گاڑی بالکل خالی تھی ۔ مزدور نے دروازہ کھولا سامان رکھا اور میاں اندر گھسے ریل چل پڑی مگر میاں پریشان کہ اماں کو کہاں ڈھونڈوں ۔ میرٹھ تک اُن کا نہ جانے کیا درجہ ہو جائے ۔ پاندان بھی تو اُن کے پاس نہیں ۔ لوٹا کٹورا بھی رہ گیا ۔ جس گاڑی میں یہ بیٹھے انہیں کیا خبر کہ اماں جان ہی والی گاڑی ہے اور بنچ پر جہاں آپ تشریف فرما تھے ٹھیک وہیں نیچے وہ دم سادھے پڑی تھیں ۔

جمنا کے پُل پر پہنچ کر ریل کی گڑگڑاہٹ ہوئی اور نانی لبتی نے گھبرا کر بدحواسی میں اُٹھنا چاہا ۔ سر میں بنچ کی کھٹاک سے ٹکر لگی ۔ ہائے ہائے کی آواز سُن کر صاحبزادے چونکے ۔ جُھک کر کیا دیکھتے ہیں کہ اماں جان پسینے میں شرابور سُکڑی ہوئی پڑی کراہ رہی ہیں ۔

بیٹا : ہائیں اماں جان !

نانی لبتی : کیوں اب بھی آئے ہوتے ! شاباش بیٹا شاباش ماں بندی کا خوب لکھا پورا کیا ۔ اب کھائی سو کھائی اب کھاؤں تو رام دُہائی ۔ میں نے قسم کھائی ہے

جو کبھی تیرے ساتھ کہیں جاؤں نہ ہوئے آج کو خاں صاحب ان مُوئے بھلے مانسوں کی آبرو کے دشمن ریل والوں کو کھا جاتے ۔

بیٹا : ارے بی تم یہاں کیوں لیٹی ہو ۔ باہر نکل کر اُوپر بیٹھو ۔

نانی تبستی : تیرا جی چاہتا ہے میں بازار میں بیٹھوں ۔ مُردوے مجھے دیکھیں ۔

بیٹا ، آپ کیا کہتی ہیں ۔ یہاں بازار کیسا ؟ کون مُردوا یہاں بیٹھا ہے ۔

نانی تبستی : (جھانک کر) یہاں نہ سہی ۔ باہر تو بھیڑ لگی ہوئی ہے ۔

بیٹا ؛ کوئی بھی نہیں ہے ۔ باہر آکر دیکھو ۔

بیٹے نے بڑی مشکل سے بڑی بی کو باہر نکال کر بنچ پہ بٹھایا ۔ مگر وہ اپنی کہے جاتی تھیں ۔

نانی تبستی ؛ اسی ریل کی تعریف کرتے تھے ۔ ذرا دیر میں آتے تو میرا مُردہ دیکھتے ۔ یہ موئی گاڑی ہے جیسے چوہے دان بھلا اس تختے کے نیچے آدمی کیوں کر بیٹھے ۔ لیٹا بھی تو نہیں جاتا ۔ میاں تم نے مجھ سے کب کا بدلہ لیا ہے ۔ میرا تو کچومر نکل گیا ۔ مجھ نگوڑی کو کیا خبر تھی کہ ریل میں عورتوں کی یہ مٹی پلید ہوتی ہے ۔

بیٹا : آپ نے بھی تو غضب کیا اس تختے کے نیچے لیٹ گئیں ۔

نانی تبستی ؛ اُوپر پردے کی کون سی جگہ تھی ۔

بیٹا ، مگر یہ تو اسباب رکھنے کی جگہ ہے بیٹھنے یا لیٹنے کی نہیں ۔

نانی تبستی ، تو مچان پہ بٹھا گئے ہوتے ۔ سیڑھی بھی تو کمبختوں نے نہیں لگائی ۔ عورتیں کوئی بلیاں ہیں کہ اُچک کر چڑھ جائیں گی ۔

بیٹا ؛ جہاں اب بیٹھی ہیں یہاں کیوں نہ بیٹھیں ۔

نانی لبستی: جدا ہی تم نے پردے باندھ دیے تھے۔ مردوں کو اپنا تماشا دکھاتی ہو؟

بٹیا: ایسا ہی پردے کا خیال تھا تو برقع اوڑھے رہتیں۔

نانی لبستی: تمہارے تو میاں دیدے ہوائی ہو گئے ہیں۔ اپنی بیوی کو اس طرح پھرانا مجھے تو معاف رکھو۔

بٹیا: تم کو تو وہم ہو گیا ہے۔ چلتی ریل میں کون آئے گا جو تمہاری بے پردگی ہوگی۔

نانی لبستی: خیر بٹیا تم سے کون بحث کرے۔ اوکھلی میں سر دیا ہے تو موسل کے دھماکے بھی کھانے پڑیں گے۔ اللہ ساتھ خیر کے میرٹھ پہنچا دے۔

خدا کی سنوار اس حافظے کو نانی لبستی کو لا کر ریل میں تو بٹھا دیا اور یہ سنانا بھول ہی گیا کہ چلنے کی جلدی میں نہانے جو بیٹھیں تو گھڑیا کے بدلے کھلے منہ کے پتیلے میں پانی سمو لیا۔ غسل خانے میں اندھیرا تھا۔ دھیان سفر میں پڑا ہوا۔ بال دھوتے دھوتے پتیلے پر نظر پڑی۔ اس میں صورت دکھائی دی۔ بال کھلے۔ ملتانی میں لت پت۔ ننگی دھڑنگی بے تحاشا چیخ مار کر باہر بھاگیں۔ باورچی خانے سے بہو، دالان میں سے بیٹی دوڑیں " اماں جان کا برا حال۔ گھگی بندھ گئی۔ پکڑ کر پلنگ پر لٹایا۔ کپڑا اُڑھایا۔ بڑی دیر میں اوسان درست ہوئے تو پوچھا "خیر تو ہے۔ کوئی نیولا تو نہیں آگیا" نانی لبستی کی نیولے کی صورت سے جان نکلتی تھی بولیں "نہیں بیٹی۔ نیولا موا کہاں سے آیا۔ تھو، تھو، چھل پائی آگئی تھی"

بیٹی: چھل پائی! چھل پائی غارتن کہاں سے آئی۔ ہم تو سب سامنے ہی بیٹھے ہیں پرچھائیں دکھائی دی ہوگی۔

نانی لبستی: لو اور سنو۔ مجھے بالکل ہی اندھا سمجھ لیا۔ یقین نہیں آتا تو جاؤ دیکھ لو مردار پتیلے میں بیٹھی ہے۔ بال بکھیرے۔ ایسی ڈراؤنی شکل میں نے اپنی عمر میں دیکھی نہیں

چڑیل نے میرا پانی بھی گندہ کر دیا۔

بیٹی بہو غسل خانے میں گئیں کہ دیکھیں پتیلے میں کیا چیز ہے جس سے یہ ڈر گئیں۔ جا کر دیکھتی ہیں تو کچھ بھی نہیں۔ پانی ایسا صاف ہے کہ منہ دیکھ لو۔ انہیں بھی اپنی صورتیں نظر آئیں۔ بہو زیادہ تیز تھی سمجھ گئی کہ اپنا حلیہ دیکھ کر ڈر گئیں۔ نند سے کہا اور دونوں نے آ کر نانی لسّی کو سمجھانا شروع کیا کہ بی کون چھل پائی اور کیسی بھتنی؟ وہ تو خود تمہاری شکل تھی جسے پانی میں دیکھ کر تم ڈر گئیں۔ بولیں "تم مجھے چلاؤ تو نہیں۔ اللہ اللہ اب میری ایسی چڑیلوں کی سی صورت ہو گئی۔" بیٹی نے لا کر آئینہ دکھایا تو کہیں جا کر سمجھیں۔

بہن کے ہاں میرٹھ میں نانی لسّی نے کیا کیا شگوفے چھوڑے، ہمیں خبر نہیں۔ دوسرے وہاں ان کا رہنا ہی کے دن ہوا۔ پرانے وقتوں کی عورتیں غیر جگہ زیادہ ٹکتی ہی نہ تھیں۔ آپ بھلے اپنا گھر بھلا۔ نانی لسّی تیسرے روز واپس آ گئیں۔ یہاں غسل خانے میں چھل پائی کے آ جانے کی داستان پڑوسیوں اور رشتے داروں کنبے والوں کو معلوم ہو گئی تھی۔ جو اُن سے ملنے آتا اِس کا ذکر ضرور کرتا۔ لڑکیاں کہانی کی طرح سُنتیں اور نانی لسّی بُرا ماننا کیسا اپنے بھولے منہ سے ہر ایک کو سُناتیں کہ "بنو! کیا کروں اللہ نے دل ہی ایسا بنایا ہے۔ ایک دفعہ خاصی عُمر تھی پرچھائیں دیکھ کر ڈر گئی چار مہینے بخار آیا۔ میاں کالے کا علاج رہا۔ کہتے ہیں کہ پرچھائیں سب سے زیادہ ظالم ہوتی ہے۔ دیکھو نا کیا مقدور کہ کسی آدمی کا ساتھ چھوڑے پرچھانوے سے تو بیٹی اچار تک میں کیڑے پڑ جاتے ہیں۔

کنبے میں ایک بہت شوخ بلا کی شرارت بھری لڑکی تھی نام تو خاصا زبیدہ تھا۔ پیار سے جتو کہہ دیتے لیکن سب اسے شِتابہ کہنے لگے تھے اس نے جو نانی لسّی کا قصّہ سُنا۔ اس کے ہاتھ ایک نیا شگوفہ لگا۔ ایک دن برقع اوڑھ وہ تو لیوں بیچ تو رہتی ہی تھی

چپکے سے آدھمکی ۔ گرمیوں کے دن تھے، دوپہر کا وقت سارا گھر سو رہا تھا ۔ ظہر کے وقت نانی لبستی سب سے پہلے نماز کے لیے اٹھیں ۔ نشاط نے کیا غضب ڈھایا کہ لمبا گیردا گرتا پہن ڈاڑھی لگا، بال بکھیر دست پناہ ہاتھ میں لے سامنے آکھڑی ہوئی اور موٹی آواز بنا کہنے لگی ۔ "لا گھی شکر دے" ۔ نانی لبستی کے ہاتھ سے لوٹا چھوٹ گیا ۔ گھگی بندھ گئی ۔ خیر گذری کہ پیشاب خطا نہ ہوا ۔ آنکھیں بند کر لیں ۔ ڈر کے مارے چیخ بھی نہ سکیں ۔ ہاتھ باندھ کر اشارے سے کہا: "ابھی دیتی ہوں جو کہو گے دوں گی ۔ خدا کے لیے باہر چلے جاؤ وہیں سب کچھ پہنچ جائے گا" ۔

نشاط آخر لڑکی ہی تو تھی اسے ہنسی آنے لگی ۔ اس سے پہلے کہ کوئی نانی کے پاس آئے برابر زینہ تھا جھٹ اوپر چڑھ کپڑے بدل نانی کے پاس آموجود ۔ اور وہ حیران کہ آج کیا ہوا ۔ پھر کوئی پچھل پائی تو نہیں آگئی ۔ نشاط نانی سے لپٹ لپٹ کر پوچھ رہی ہے کہ نانی کون تھا کسے گھی شکر دے رہی تھیں" ۔ نانی لبستی غریب کیا جانیں کہ سارے کرتوت اسی فتنی کے ہیں بولیں "بیٹی تیرا کورا پنڈا ہے تو سن کر کیا کرے گی ۔ دور پار کچھ ایسی ویسی ہو گئی ۔ تو تیری ماں کو کیا جواب دوں گی" ۔ اور اپنی بیٹی سے مخاطب ہو کر کہنے لگیں ۔ اسی لیے تو میں رنڈیا جھینکتی رہتی ہوں کہ دوپہر کو کنڈی لگا کر سویا کرو ۔ مگر کون سنے آج ایک جوگی اندر گھس آیا نا ۔ اللہ نے بڑی خیر کی ۔ کوئی لڑکی بالی سامنے نہ تھی نہیں تو مکھی بنا کر جوڑے میں رکھ لیتا ۔ مجھ کو دیکھ کر اپنا چمٹا بجانے اور گھی شکر مانگنے لگا ۔ بمشکل ہاتھ جوڑ کر اسے باہر نکالا ہے ۔ پھر سب نے ہزار سمجھایا، نشاط نے بھی لاکھوں قسمیں کھائیں کہ نانی وہ تو میں تھی ۔ نانی لبستی اپنی ہی رٹ لگائے گئیں کہ بی ہوش کو بتاؤ ۔ کہاں یہ چار انگل کی چھوکری کہاں وہ جگادری جوگی ۔ مجھے تم نے ایسا بھولا سمجھ لیا ہے ۔ آنے دو اپنے بھائی کو، گھی شکر بھیجوں اب وہ گھر کو تاک گیا ہے ۔ اندھیرے اجالے آ گیا تو تمہارا کچھ نہیں جائے گا میری موت آجائے گی ۔ بیٹی تم کیا جانو

ان جوگیوں میں بڑے جادوگر ہوتے ہیں۔ جو یہ مانگیں ان کی بھینٹ پوجا کر دینی چاہیئے۔

ایک دفعہ کا ذکر سنو۔ برسات کا موسم تھا۔ بیٹیاں آئی ہوئی تھیں۔ بہو کو شوق اُچھلا کہ قطب صاحب چلنا چاہیے نانی بستی کی چہیتی بہو۔ دنیا ٹل جائے اور بہو کا یہ کہنا نہ ٹلے۔ بیٹے سے کہا اسے کیا انکار۔ بیوی کی فرمائش بہنوں کا شوق اور ماں کا فرمان۔ جا کر بہلی والے کو سائی دے آئے۔ رات بھر کھانے پکے۔ پکوان تلے گئے۔ صبح چار بجے بہلی آئی اور سب لد کر چلے۔ بہلیوں، چھکڑوں میں بیٹھ کر جانے کی بہار تانگوں اور موٹر والوں کو کہاں نصیب۔ چار پیدل ہیں دو سوار۔ جنگل آیا ایک اِدھر دوڑ رہا ہے تو ایک اُدھر گاتے بجاتے ہنستے بولتے چھم چھم مینہ برس رہا ہے۔ بھیگتے بھگاتے چلے جا رہے ہیں۔

چار بجے کے چلے چلے دس بجے قطب پہنچے۔ بہو نے ضد کی۔ لاٹھ کے نیچے اتر پڑے نانی بستی کہہ رہی ہیں اللہ تیری شان۔ بنانے والوں نے کہاں بیٹھ کر بنایا ہوگا۔ بہو نے مُسکرا کر کہا۔ "ابا جان کہتے ہیں لٹا کر بنائی تھی۔

وہ بولیں "ہاں بیٹی اور کیا۔ اتنی لمبی، لہکاری لاٹھ کو سیدھا کون بنا سکتا ہے اچھا پھر کھڑا کیوں کر کیا؟ ہزاروں آدمی لگے ہوں گے۔ اور پھر زمین پر یہ بھی کس طرح؟ نہیں بیوی میری تو عقل کام نہیں کرتی۔ دیکھے سے ہول آتا ہے۔" غرض کہ تھوڑی دیر لاٹھ کے اردگرد چکر لگا درگاہ میں حاضری دی۔ وہیں شاہ عالم کے مزار کی طرف عالمگیر کی مسجد میں بیٹھ کر کھانا کھانا۔ کھانے پینے سے فارغ ہوئے تو سیر سپاٹے کی سوجھی برقعے اوڑھ درگاہ سے نکلے۔ آگے آگے چھوٹے خاں صاحب اور پیچھے پیچھے عورتوں کی قطار۔ اولیا مسجد جا رہے تھے۔ اُن دنوں قطب میں نہ اتنی آبادی تھی نہ اتنی دکانیں۔ ویرانے ہی ویرانے دکھائی دیتے۔ پہلے جھرنے کی طرف نکل گئے۔ جامنیں چن چن کر کھائیں۔ ذرا دم لے کر چلے۔ اور سب جوان نوکچی پکی

قبروں کو لانگتی پھلانگتی ہرنیوں کی طرح جاتی تھیں۔ نانی بستی کی ٹانگوں میں اتنا دم تھا دوسرے ان کا مزاج وہمی۔ کسی قبر پر بھولے چوکے پاؤں پڑا اور انہوں نے توبہ کی۔ راستے میں کیکر کی ایک ٹہنی پڑی تھی۔ اتفاق کی بات ہوا سے بُرقع جو اُڑا تو اس ٹہنی سے جا اُلجھا۔ انہیں خبر نہیں۔ جب بوجھ سا معلوم ہوتا تو کہتیں نگوڑا ابھیگ کر کتنا بوجھل ہو گیا ہے اور کبھی "لے یہ کون گھڑی گھڑی میرا بُرقع پکڑ کر کھینچتا ہے۔ میں پھر کوسنے لگوں گی" کہہ کر برقع کا پلّہ جھٹکنے لگتیں۔ ٹہنی کیا چھوٹتی وہ ساتھ ساتھ تھی۔ چھوٹی بیٹی کو جو ہنسی سُوجھی تو اس نے کہیں پکار کر کہہ دیا کہ اماں جان تمہارے پیچھے یہ کون؟ یہ سننا تھا کہ نانی بستی کو بھوت نظر آنے لگا۔ سوکھی ہوئی ٹہنی کے زمین پر گھسٹنے کی آواز کو وہ سچ مچ پچھل پائی کے چلنے کی آہٹ سمجھیں۔ پیچھے دیکھے بغیر بھاگیں۔ جوں جوں بھاگتیں۔ ٹہنی ٹانگوں میں اُلجھتی۔ چیخیں مارنے لگیں۔ "ہے ہے آج تو بھتنی لپٹ گئی ارے دوڑنا میری ٹانگوں کو کھا لیا۔" دوڑتے دوڑتے بیچاری گر پڑیں۔ اتنے میں بیٹا بیٹیاں اور بہو بھی آپہنچیں اُٹھایا۔ اب آنکھیں بند ہیں اور کہہ رہی ہیں "تم نے قبرستان میں لا کر چڑیل لپٹا دی نا۔ کمبخت کہتی تھی کہ مجھے گھر میں رہنے دو نہ مانا۔" بہو نے کہا "اماں جان چڑیل کیسی؟ نگوڑی کیکر کی ٹہنی برقع میں اٹک گئی تھی۔ دیکھئے اور اُلجھی ہوئی ٹہنی دکھائی۔ ان چھوٹی صاحب نے آپ کو ڈرایا۔"

پیر جی سنگھاڑا

مایا کے تو تین نام سُنے ہوں گے۔ پرسو، پرسا، پرسرام۔ مطلب یہ کہ دولت جس کے پاس جاتی ہے اُس کے اگلے پچھلے سارے حالات بدل جاتے ہیں۔ چمار سے راجہ، بنو سے نواب بنا دیتی ہے۔ اسی طرح درویشی کے بھی تین نام ہیں۔ ننگا ہے تو فقیر۔ کمبل اوڑھ لیا کوئی متکیہ سنبھالا تو شاہ جی۔ کسی گدّی پر جا بیٹھے اپنا بانا الگ اختیار کیا۔ چھو چھکّا ہونے لگی تو حضرت میاں صاحب ابوالحسنات چشتی یا جیسا دل چاہا بن گئے۔

پیر جی عین اللہ شاہ قدوۃ السالکین۔ اشرف العارفین۔ زبدۃ العاشقین قدس سرہٗ العزیز کے عرس شریف میں کبھی آپ حاضر ہوئے ہیں؟ کیوں نہیں۔ اور اگر بدقسمتی سے آپ کو وہاں حاضری کا اِتفاق نہیں ہوا تو اس کی دھوم دھام ضرور سُنی ہو گی۔ لیکن یہ بھی کسی سے پوچھا کہ ان بزرگ کی کسی نے زیارت بھی کی ہے۔ شہر میں اس سرے سے اُس سرے تک پوچھتے چلے جایئے، میں دعوے کے ساتھ کہتا ہوں جو کوئی اس نام سے بھی آشنا نکلے۔ زندگی میں وہ کچھ ہوتے تو لوگ جانتے۔ یہ بات نہیں کہ شہر میں ان کا وجود نہ تھا۔ لیکن نہ ان کی یہ کیفیت تھی نہ ان کا درویشوں فقیروں میں یہ درجہ کہ مرنے کے بعد ان کے مزار پر پھولوں کی چادریں چڑھتیں، ڈھولک کھڑکتی اور کسی کو حال آتا۔

یہ تو میں نہیں بتاؤں گا کہ وہ شہر کے کس محلّے میں رہتے تھے ہاں اگر وہاں جا کر

کوئی آج بھی پوچھے کہ پیر جی سنگھاڑا کو جانتے ہو تو بڈھے ٹھڈوں میں دو چار ضرور ایسے نکل آئیں گے جو کہیں گے "ہاں بھئی کیوں نہیں۔ فلاں کوٹھی میں ان کی بیٹھک تھی اور غریب سارا دن اونگھا کرتے تھے مگر معصوم ہونے میں شک نہیں۔ بیچارے سوا پیسے کا تعویذ لکھتے پھر بھی کوئی نہ آتا۔ جب دیکھا مراقبے ہی میں دیکھا واقعی اس میں شک نہیں کہ بالکل معصوم تھے صورت بھی اللہ نے ایسی بنائی تھی کہ پیر جی سنگھاڑے کی پھبتی خوب رہی اور ایسی خوب کہ جیتے جی اسی نام سے مشہور ہو گئے۔ ان کا لڑکپن دیکھنے والا دلی میں کبھی کوئی پیدا نہیں ہوا۔ کہاں سے ہوتا۔ انہوں نے یہاں کب جنم لیا تھا۔ جب یہ دلی میں نمودار ہوئے ہیں چوبیس پچیس برس کی عمر سے کم نہ ہوں گے۔ نمودار ہونے سے میرا مطلب ان کے دلی آنے سے ہے۔ نمود تو غریب نے کبھی حاصل ہی نہیں کی جیتے جی بیچارے کا ایک تعویذ نہ چلا۔ ہر چند بیٹوں نے اپنی ماں کی نسبت سے انہیں پیران عظام کی اولاد بنایا تاہم پیر نہ بنا سکے۔ مرنے کے بعد البتہ اُن کی قبر کے تعویذ کو جیسی چاہئے تھی شہرت دی۔

اچھا تو پہلے آپ اُن کا حلیہ سُن لیجئے کہ پیر جی سنگھاڑا کی پھبتی جو ان پہ کسی گئی، ٹھیک تھی یا غلط۔ چہرہ عین مین سوکھا ہوا سنگھاڑا تھا بالکل تکونہ۔ سر پر خشخاشی بال۔ ماتھا بہت چوڑا۔ ناک لمبی۔ کنپٹیاں چوڑی چوڑی۔ کان بڑے بڑے۔ کلّے پچکے ہوئے۔ کنپٹیاں سے اُتر کر ٹھوڑی تک اگر دو خط کھینچے جائیں تو اُقلیدس کا ایک مثلث سمجھ لو۔ گویا ٹھوڑی پندرہ ڈگری کا زاویہ تھی۔ ڈاڑھی کے نام سے صرف ٹھوڑی پر گنتی کے بال تھے۔ شاید تیس چالیس ہوں گے۔ منہ میں دانتوں کا کھنڈر تھا۔ دو چار ڈاڑھیں تھیں تو ایسی بے ترتیب کہ سیدھے منہ بات نہ کر سکتے۔ رنگت بھی خشک سنگھاڑے جیسی مٹیالی سی۔ اس پر چیچک کے داغوں نے الگ گل افشانی کر رکھی تھی۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ موتیا کا پودا دھوپ میں مرجھا گیا ہے اور اس پر کیسی

ہوئی کلیاں مرکر بدرُوپ ہوگئی ہیں۔

کپڑوں کی وضع یہ تھی کہ کبھی نیلا تہمد باندھ لیتے تو کبھی ایک بَر کا پاجامہ سُوکھی سُوکھی ٹانگوں پر ہوتا۔ تہمد پر گریبان چاک لمبا کرتہ پہنتے تو ایک بَر کے پاجامے کے ساتھ لیتھے کی نیم آستین سر پہ کبھی کشتی نما ململ کی ٹوپی، کبھی رومال کا قصابہ۔ گلی کی جھوت میں ایک کوٹھڑی کرایہ پر لے رکھی تھی۔ اس میں بوریا بچھائے دوچار حنائی کاغذ اور قلم دوات لیے اللہ کی یاد میں دوزانو بیٹھے رہا کرتے تھے۔ بھولے چوکے کوئی تعویذ لینے آگیا تو تعویذ لکھ دیا اور جو اس نے پیسہ دھیلا دے دیا لے لیا۔ ورنہ منہ دیکھتے رہ گئے۔ مرغیاں حلال کرنے اور بکریاں ہضم کرنے والوں کی اس زمانے میں بھی کچھ کمی نہیں تھی لیکن آپ جانیئے جیسا ملا ویسے نمازی غریب کو دکانداری کے ڈھنگ آتے تھے نہ دکان میں شعبدہ بازی کا سامان تھا ایسے مومنا چومنا کو بھلا کون پتیاتا۔

دوسرے مسکین اور بھولے بھالے بھی کچھ اس درجہ واقع ہوئے تھے کہ کسی تعویذ گنڈے والے کو تو ایسا دیکھا نہیں۔ اس قسم کے آدمی لوگوں کے لیے تماشا اور کھلونا بن جاتے ہیں۔ محلّے کے نوجوان اکثر مذاق کیا کرتے۔ مذاق آج کل جیسا بیہودہ نہیں بلکہ کوئی چار ریوڑیاں لیے چلے آتا ہے۔ "پیر جی آج قاضی کے حوض کی طرف جو گیا سانڈ گھورنے لگا۔ ایسا تعویذ دو کہ پھر نہ گھورے" کوئی دمڑی کی میٹھی کھیلیں آگے رکھ کر کہتا کہ "گھر میں چھپکلیاں بہت ہوگئی ہیں، کوئی فلیتہ جلانے کو ایسا دو کہ وہ بھاگ جائیں"۔ معصوم صفت پیر جی سانڈ والے کو تعویذ لکھ دیتے اور فلیتہ مانگنے والے کو فلیتہ۔ انہیں قطعی مذاق کا گمان نہ ہوتا۔

ہمارے ہاں امراؤ امراؤ ایک بٹر بلّی سی عورت اُوپر کے کام پر نوکر تھی۔ لڑکیوں کو جب دل لگی سوجھتی تو اسے پیر جی کے پاس بھیجتیں کہ امراؤ ذرا پیر جی کے پاس تم

چلی جاؤ ان سے کہنا کہ "ہماری موتی کو کئی دن سے درد لگے ہوئے ہیں۔ بیچاری تڑپ رہی ہے۔ بچے نہیں ہوتے۔ ایسا کوئی تعویذ دو کہ آسانی سے بچے ہو جائیں" ہمارا گھر محلے میں مشہور تھا۔ پیرجی ہمارے ہاں کے بچے بچے کو پہچانتے تھے۔ جہاں امراؤ گئیں اور انہوں نے مراقبے سے سر اٹھا کر پوچھا۔ "بڑی بی کیسے آئیں"؟

امراؤ: میاں لڑکیاں جان کھائے جاتی ہیں تم ایک تعویذ تو دے دو۔

پیرجی: کس بات کا؟

امراؤ: اے موتی کے لیے، ننھی بیگم نے بھیجا ہے۔

پیرجی: موتی کون اسے کیا ہوا؟

امراؤ: بلّی ہے اور کون اس کے بچے نہیں ہوتے۔ درد لگے ہوئے ہیں۔ بھلا ان جانوروں کے لیے بھی کوئی تعویذ منگایا کرتا ہے۔

پیرجی: کیوں نہیں۔ اور وہ بڑی احتیاط سے کاغذ اٹھاتے۔ قلم کے سرے پر کچھ پڑھ کر پھونکتے اور تعویذ لکھ کر دے دیتے۔ کبھی میری چچی کہتیں "امراؤ اچھی پیرجی کے پاس تو ہو آؤ۔ یہ لو دو دھیلے۔ آج آٹھ دن ہوئے نگوڑی سفید مرغی کو ایسی نظر لگی ہے کہ انڈے دینے ہی چھوڑ دیے، کوئی تعویذ تو لے آؤ" وہ پیرجی کے پاس جاتی اور پیرجی اسی اہتمام کے ساتھ مرغی کے لیے بھی تعویذ لکھ دیتے۔

ہمیں اپنے بڑوں کی تعلیم تھی کہ ہر بزرگ کو جھک کر سلام کریں اور اُن کی دعا لیں میں جب ادھر سے گذرتا پیرجی کو سلام کرتا وہ دعا دیتے کبھی کبھی اپنے پاس بلا کر بٹھا بھی لیتے اور ایسی ایسی بھولی باتیں کرتے کہ اس عمر میں مجھے ہنسی آجاتی۔ مثلاً "کیوں بھئی۔ تمہارے ہاں تو سب نمازی ہوں گے"؟

میں: جی ہاں نانا ابا اماں منجھلی خالہ سنجھلی خالہ سب نماز پڑھتے ہیں۔ ایک چھوٹی خالہ اور میری بہن نہیں پڑھتیں۔

پیر جی: اپنے نانا سے کہنا انہیں ماریں اور خوب ماریں۔

میں: بہت اچھا۔

پیر جی: پھر مجھ سے تعویذ لکھوا کر لے جانا۔

میں: تعویذ سے کیا ہوگا؟

پیر جی: اے بھئی اللہ کے نام کی برکت سے جانور تک نماز پڑھنے لگتے ہیں۔

میں: بلیاں مرغیاں بھی؟ ہمارے ہاں تو یہی جانور پلے ہوئے ہیں۔

پیر جی: مرغے صبح کو اذان دیتے ہیں یا نہیں۔ پھر جو اذان دے گا وہ کیا نماز نہیں پڑھے گا۔

میں: موتی کو تو ہم نے کبھی نماز پڑھتے دیکھا نہیں۔

پیر جی: نہیں پڑھتی بڑی کمبخت ہے اس میں کوئی کافر جن سمایا ہوا ہوگا۔ اچھا میں فلیتہ دوں گا۔ اس کی ناک میں دھونی دے دینا۔ جن بھاگ جائے گا اور وہ نماز پڑھنے لگے گی۔ غرضیکہ وہ اسی قسم کی باتیں کیا کرتے اور ایک مجھ سے ہی نہیں بلکہ ہر ایک چھوٹے بڑے سے۔ صبح سے دوپہر تک اور دوپہر سے مغرب تک بڑی پابندی کے ساتھ اپنی کوٹھی میں بیٹھے رہتے۔ دنیا کے کسی معاملہ سے انہیں تعلق نہ تھا۔ بیوی، تین لڑکے اور ایک بیٹی تھی مگر ان کے ساتھ صرف اتنا ہی واسطہ سمجھتے کہ میاں اور باپ تھے۔ اس سے غرض نہیں کہ وہ کہاں سے کھاتے پہنتے کیا کرتے ہیں اور گھر کیوں کر چلتا ہے بیوی کا علاقہ اگر ایک مشہور خانوادہ سے نہ ہوتا تو روٹیوں کے بھی لالے پڑ جاتے کیونکہ

عام طور پر جب کوئی محنت و مشقت نہیں کر سکتا تو جھوپ چھلکے سے آسان کوئی روزگار نہیں۔ لیکن پیر جی بننے کے لیے بھی ایک خاص سیان پتی کی ضرورت ہے۔ اسی لیے تعویذ گنڈا کرنے والوں کو سیانے کہتے ہیں۔ تاوقتیکہ ان میں کوئی مخصوص قابلیت نہ ہو چھل ٹھول سے کام لینا نہیں آئے عمر بھر بیٹھے رہیں۔ کس نمی پرسد کہ بھیّا کون ہو۔

بیٹوں کی شادیاں بھی نانا کے نام کی بدولت خاصے کھاتے پیتے گھرانوں میں ہو گئی تھیں لیکن ان کا رویّہ دوسرا تھا۔ اپنے اپنے رنگ میں سب الگ۔ ایک تو سُسرال میں ہی جا رہے تھے۔ باپ کی طرف کبھی آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھتے چھیلا بنے پھرتے۔ دوسرے بھی بیوی کا ہاتھ تکنے والے۔ ماں باپ کی بالکل پرواہ نہ تھی۔ لڑکی شکل میں تو اللہ کا نور تھی۔

بچپن اور جوانی تو دیکھنے والوں نے دیکھی ہو گی۔ ہمیں جب دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے تو عجب حُلیہ تھا چھاج نما کان چھوٹا ماتھا۔ دہانہ پھٹا ہُوا۔ ناک باچھوں تک پھیلی ہوئی۔ نتھنے ایسے جیسے شربت کی کلھیاں کلّے تپکے ہوئے آنکھیں زیرہ سی۔ جبڑے کی ہڈیاں اُٹھی ہوئی رنگ مٹیالا۔ جب باتیں کرتیں کولھوں پر ہاتھ رکھ کر اور نتھنے برابر پھڑکتے رہتے۔ جامہ زیب البتہ تھیں۔ بڑھاپے میں بھی اگر اُجلے کپڑے پہن لیتیں تو لاکھ لاکھ بناؤ دیتے۔ بچپن میں بھی اس سے زیادہ حسین نہیں ہوں گی۔ لیکن ماں باپ کے لیے اولاد کا حسین ہونا محبّت میں کمی بیشی کا سبب نہیں ہوتا۔ حضرت صاحبہ قبلہ جتنا انہیں چاہتے تھے اتنی گردیدگی بیٹوں سے بھی نہ تھی۔

پیر جی سنگھاڑا تو کسی نہ کسی طرح اپنی زندگی کے دن گزار کر اللہ کو پیارے ہوئے۔ باپ کی گدّی خالی ہوئی تو چھوٹے صاحبزادے کو اپنی پیرزادگی کا رنگ جمانے کی سُوجھی۔ دہلی سے باہر ایک پیر سے جا بعیت ہوئے۔ کئی سال ان کی خدمت میں رہ کر چلّہ کشیاں کیں۔ پیری مریدی کے آداب و قاعدے سیکھے جب وہاں سے آئے گلے میں کفنی اور ٹانگوں میں نیلا تہمد

تھا کھپریل ڈال بوریا بچھا، تسبیح لے تعویذ گنڈا کرنے لگے۔ دن بھر بیٹھے منن متاں کیا کرتے اور رات کو یاروں میں پوچھکتے اُڑاتے، بھلا ایسی صورت میں تعویذ گنڈا کیا چلتا۔ ان کا خود بیان ہے کہ تین سال تک کامل میری یہی حالت رہی اوّل تو کوئی تعویذ لینے نہیں آتا اور اگر کوئی بڑھیا ٹھڑیا آبھی جاتی تو پلّے کچھ نہ پڑتا مُفت کی قلم گھسائی تھی۔

ان کے کئی یار غار تھے۔ جب کئی سال مکھیاں اُڑاتے گزر گئے اور میاں کو کسی نے نہ پوچھا کہ اب کیا کرنا چاہئے؟ یاروں میں سے دو بھائی واقعی ان کے ہمدرد نکلے، تھے بھی وہ دنیا بھر کے فتّی۔ بڑے حرّاف۔ زمین آسمان کے قلّابے ملا دینے والے۔ بولے "واہ پیر جی آج تک دائی سے پیٹ چھپایا کیے۔ پہلے سے کہہ دیتے تو یہ نوبت کاہے کو آتی سچ مچ کے پیر جی بنے ہوئے مدّتیں گزر گئی ہوتیں۔ خیر اب بھی کچھ نہیں بگڑا ہے۔ گنتے گنتے بھول گئے پھر گننے لگے، کل سے دیکھو کیا ہوتا ہے کسی کو بجوانا تو یاروں کے بائیں ہاتھ کے کھیل ہیں کچھ فکر نہ کرو۔ آؤ ایک گنجفہ کی بازی ہو جائے لیکن آج بغیر بدے نہیں کھیلیں گے۔ تمہاری رتی تو دیکھیں چڑھی ہوئی ہے یا اُتری ہوئی۔ اگر اُتری ہوئی ہے تو تم تو اپنا چھو منتر کرتے ہی ہو۔ ہماری پھونک کی بھی تاثیر دیکھنا۔"

پیروں کی کرامات سے زیادہ ان یاروں نے کمالات دکھائے۔ صبح ہی اپنے گھر کے باہر مونڈھے بچھا کر بیٹھ جاتے۔ پکار پکار کر راہ گیر سنیں۔ اللہ والوں کاملوں عاملوں کی جھوٹی سچّی کہانیاں کہتے۔ دو چار نوجوان بُڈھے بُڑھیاں ایسے بھی نکل آتے جو پوچھ بیٹھتے "خاں صاحب یا بھیّا یا بٹیا یا میاں صاحبزادے یہ تو پُرانے قصّے ہیں اب بھی کوئی ہے؟"

خاں صاحب: (بھائی جان یا چچا میاں یا خالہ کہہ کر) دنیا تو نہیں بدل گئی۔ اللہ میاں نے اچھے بندے پیدا کرنے تو نہیں چھوڑ دیے۔ ہاں ہماری آنکھیں اگلے لوگوں کی سی نہیں رہیں

ہم کو نہیں سوجھتے۔

لوگ: (عورت یا مرد) سورج نکلا ہوا ہوتا ہے تو اس کی گرمی سے اندھے بھی سمجھ لیتے ہیں

خاں صاحب: اور جو بیٹے کے بھی اندھے ہوں۔ ارے بھئی خدا نے تم کو گھر بیٹھے نعمت دی ہے اور تم اس کی کچھ قدر نہیں کرتے۔

لوگ: ارے صاحب اگر ایسا ہے تو ہماری خوش نصیبی میں شک نہیں۔ کوئی بزرگ باہر سے تشریف لائے ہیں کہاں اُترے ہیں بتائیے کم از کم ان کی زیارت تو کریں۔

خاں صاحب: میاں گھر کی مُرغی دال برابر ہوتی ہے۔ باہر والوں کو پُوچھتے ہو۔ گھر کے پیروں کو تیل کا ملیدہ۔ اب تک تو وہ تمہارے دعا گو ہیں۔ اگر خدا نہ کرے انہیں تمہاری بے مرّوتی دیکھ کر جوش آگیا اور اُلٹی تسبیح پھیر دی تو رو دو گے۔

لوگ: آخر ہم بھی سُنیں ایسے چھُپے رُستم کون نکل آئے۔

خاں صاحب: حضرت قبلہ رحمۃ اللہ علیہ کے نواسے اور پیر جی صاحب مرحوم کے چھوٹے صاحبزادہ کو نہیں جانتے۔ تین برس کی چلّہ کشیوں کے بعد شمشیر برہنہ بن کر آئے ہیں۔ سبحان اللہ سبحان اللہ۔ اوّل تو پیرزادے پھر مُرشد کی نظر خاص جو کرامت ان میں نہ ہو کم ہے، بھوت پریت جن شہید ان کے نام سے بھاگیں۔ مُردوں میں جان پڑ جائے اور پھر کسی سے کچھ سوال نہیں۔ مفت بندگانِ خدا کی خدمت کرتے ہیں۔

لوگ: اچھا آپ چھوٹے میاں کو کہتے ہیں۔ قربان ان کے نانا جان کے۔ ان کے پردہ کرنے کے بعد سے تو گویا دل خالی ہو گئے۔ کیا نام لیا ہے۔ صورت آنکھوں کے سامنے پھر گئی۔ وہ ڈلا سی سر پہ ٹوپی وہ عبا وہ قبا۔ وہ سدا سہاگنوں کی سی ہاتھوں میں جھم جھماتی ہوئی چوڑیاں۔ پالکی میں بیٹھ کر نکلتے تو کیا کہیں بازار میں نور برسنے لگتا۔ اللہ اکبر ایسی شان کا

پیر تو اب دلی کو نصیب ہوگا نہیں۔

خاں صاحب، وہ شان اور تھی اور یہ شان اور ہے۔ وہ فقیری میں امیری کر گئے۔ انہیں اپنے پیر کی تلقین یہ ہے کہ فقیری چولا نہ چھوڑیں۔ غریبوں کی خدمت کریں۔

لوگ، لیکن وہی مثل ہے کہ "کے آمدی و کے پیر شدی۔ ابھی تو بیٹھے ہیں۔ ذرا جمنے دو اگر اُن میں کوئی کرامت ہے تو خود بخود لوگ کھنچنے لگیں گے۔

چڑیمار جال تو بچھاتا ہے ہُما کے لیے لیکن ہما کا پھنسنا تو مشکل ہے چڑیاں ضرور پھنس جاتی ہیں۔ خاں صاحب کے اس پروپیگنڈے کا یہ اثر ہوا کہ دوسرے تیسرے دن سے پیر جی سنگھاڑا کے بیٹھے کے پاس دو چار برقعے والیاں، دو چار چماریاں سیٹنیاں دو چار جوان بوڑھے مرد آنے لگے۔ دنیا کی مخلوق بھیڑیا دھان ہے اور اللہ میاں کے کھیل نرالے۔ جو جس حیلے سے مانگتا ہے وہ دیتے ہیں۔ کسی ہُنر اور قابلیت کی ضرورت نہیں، صرف اس کی مہربانی چاہئے۔ طبابت میں کسی کی روزی لکھ دی ہے تو گو اسے گل نیلوفر اور گل گاؤزبان میں تمیز نہ ہو۔ اس کے ہاتھ میں بھی شفا دے دیتے ہیں چھو چھکّا سے کسی کا پیٹ پالنا منظور ہے تو خواہ اسے قلم پکڑنی بھی نہ آتی ہو اس کے ہاتھ کی لکیروں میں وہ تاثیر پیدا کر دیں گے کہ عقل کام نہیں کرتی۔ ضرورت ہے صرف تھوڑے استقلال اور بیٹھک کے سچے ہونے کی۔ پھر اگر کسی نامی طبیب یا مشہور پیر سے کوئی نسبت بھی ہے تو پانچوں گھی میں سمجھو۔

خلاصہ یہ کہ یاروں نے میاں کی دکانداری چمکائی ایسا اُنہیں اُبھارا کہ چند روز کے بعد کایا پلٹ دی۔ کھپریل کی جگہ پکا حجرہ بن گیا۔ دس پانچ شہرے چٹ مرید بھی ہو گئے دُور دُور سے لوگ تعویذوں کے لیے آنے لگے، اور خاصی بے فکری کے ساتھ اوقات بسر ہونے لگی۔

اسی اثنا میں منجھلے بھائی جو ایک دوسری قسم کی چلّہ کشی میں مصروف ہو گئے تھے۔

اپنے جاگیردار ماموں کے مقابلہ میں کامیاب ہو گئے۔ کامیابی مستقل تو نہ تھی لیکن اُنہوں نے کچھ ایسی ریشہ دوانیاں کیں کہ تینوں بھائیوں کے لیے اُن کی جاگیر میں سے تنخواہیں مقرر کرا لیں اور جب سے والد کا انتقال ہوا تھا آج تک کے ٹکے گِنوا لیے یہ رقم تقریباً چودہ ہزار کی تھی۔ تین بھائی تھے اور ایک بہن۔ دو دو ہزار نقد حصے میں آئے اور ڈھائی سو روپے مہینہ چاروں کے نام آنے لگا۔ چھوٹے میاں کو اپنی دکان میں مال بڑھانے کی سخت ضرورت تھی۔ پیری مریدی کی تجارت کے لیے ابھی کئی قسم کے شعبے کھولنے تھے چنانچہ اُنہوں نے سب سے پہلے تو اپنے باپ پیرجی سنگھاڑا کا مزار پختہ کیا اس کے گرد چار دیواری بنائی اور پھر سالانہ عرس شروع کر دیا۔ اب کیا تھا وہی مثل ہو گئی کہ نامی چور مارا جائے اور نامی دکاندار کما کھائے۔ رونق بڑھتی چلی گئی پیری نے وہ ترقی کی کہ رہے نام سائیں کا۔ شہر میں اپنے وقت کے کامل تھے تو یہ عامل تھے جب دیکھو دروازے پر گاڑیاں موٹریں کھڑی ہیں ہر طرف سے لوگ زیارت کو آتے۔ یہ بھی دورے پر جاتے۔ دستِ غیب کی یہ حالت تھی کہ بارہ چودہ ہی برس میں دو لاکھ کی جائیداد بنالی۔ بیٹوں کی شادیاں کیں تو امیروں کی طرح۔ گھر کے اندر کا رنگ بدل گیا۔ پیروں کا سا ڈھنگ ہی نہیں رہا۔ دیکھنے والے کہتے ہیں کہ ان کے گھر کا سارا چلن انگریزی ہے۔ کیسی نماز۔ کیسا روزہ۔ ہونٹوں پر سُرخی ہے اور گالوں پر غازہ۔

سدا کوئی رہا ہے نہ رہے گا۔ خاندان میں سب کی رتی یکساں نہیں ہوتی۔ چھوٹے میاں کی شہرت چھوٹے میاں کے دم تک رہی۔ اگرچہ ان پیروں کی گدی بکتی ہے تاہم وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی۔ ان کی آنکھ بند ہوتے ہی پیری مریدی کے ساز بھی ڈھیلے پڑ گئے اور مطب کا رنگ بھی پھیکا پڑ گیا لیکن پیرجی سنگھاڑے کا عُرس اب بھی اسی دھوم دھام سے ہوتا ہے۔

خالہ رحمت

خالہ رحمت آج سے کوئی پچاس برس ہوئے ہوں گے میر دلاور علی کے ہاں ان کی لڑکی شمیمہ پر کھلائی بن کر آئی تھیں۔ وقت پڑا تھا سر چھپانے کا سہارا مل گیا۔ ایسی رہیں کہ مر کر ہی نکلیں۔ ایک تو میر صاحب کا گھرانہ شریف پھر ان کے مزاج میں ایسی صلاحیت تھی کہ تھوڑے ہی دنوں میں گھر کا گھر ان کا گرویدہ ہو گیا۔ مثل مشہور ہے کہ خدمت سے عظمت۔ چھوٹے سے بڑے سب ان کی عزّت کرتے۔ یہ بھی ایک ایک پر جان دیتیں۔ کسی کی انگلی دُکھتی ان کا دل دکھتا۔ مجال تھی کہ کوئی ان کا نام لیتا۔ بچّے بوڑھے خالہ کہتے۔

جوانی تک تو ذرا بند بند رہیں۔ رنڈاپا گزارنا تھا۔ خیال ہو گا کہ کوئی نام نہ رکھے اور شرافت کو بٹہ نہ لگے۔ لیکن جوں جوں بڑھاپا آتا گیا طبیعت کی چہل بڑھتی گئی۔ سارے دن گھر میں گہما گہمی رکھتیں۔ ہنسنے ہنسانے کے سوا دوسرا کام نہ تھا۔ پہلے تو کہاں آنا کہاں جانا کہیں کُنبے رشتے کی کسی تقریب میں کوئی چلنے کو کہتا بھی تو کہہ دیتیں کہ میں جا کر کیا کروں گی آخر گھر میں بھی تو کسی کو رہنا چاہئے۔ یا اب یہ کیفیت تھی کہ جہاں کسی کو کہیں جاتے سُنا اور تڑپ گئیں۔ چاہے اُن کے جانے کا موقع ہو یا نہ ہو۔

ایک دن گھر میں ساری لڑکیاں بالیاں پردہ باغ میں بچّوں کی نمائش دیکھنے جانے کی تیاریاں کر رہی تھیں۔ خالہ رحمت نے جو دیکھا لپ جھپ کرتی اپنی کوٹھڑی سے نکل آئیں اور کہنے لگیں "کیوں بی یہ آج کہاں جانے کی صلاح ہے؟

شمیمہ : پردہ باغ میں آج بچّوں کی نمائش ہے وہاں جائیں گے۔

خالہ : بیٹی! بچّوں کی نمائش کیسی ؟

شمیمہ : خالہ! شہر میں سرکار نے بچّوں کی دیکھ بھال اور زچاؤں کی حفاظت کے لئے جگہ جگہ ہسپتال کھول دیئے ہیں۔ بڑی بڑی ڈاکٹرنیوں اور مدرسوں کی پڑھی ہوئی دائیوں کو مقرر کیا ہے کہ بے غوری سے کوئی بچہ چھیجنے نہ پائے اور عورتوں کو جاپے کی تکلیف نہ ہو۔ یہ نمائش بھی ان ہی کی طرف سے ہوتی ہے۔

خالہ : تو بی اس نمائش میں ہوگا کیا ؟

شمیمہ : شہر بھر کی عورتیں اپنے اپنے بچّوں کو لائیں گی۔ جس کا بچّہ زیادہ موٹا تازہ گل گوتھنا سا ہوگا اسے انعام دیا جائے گا۔

خالہ : لو اور سنو نظر نہیں لگے گی ؟

شمیمہ : واہ خالہ۔ نظر کیسی ؟ سب دیکھیں گے کہ فلاں کا بچّہ ماشاءاللہ کیسا طاقت ور ہے اور فلاں کا کیسا کمزور۔ انہیں بھی حرص آئے گی۔ وہ بھی اپنے بچّوں کو تندرست بنانے اور انعام لینے کی کوشش کریں گی۔

خالہ : اور وہاں کیا ہوگا ؟

شمیمہ : زچہ خانوں کے نمونے دکھائے جائیں گے۔ شفاخانوں کی ڈاکٹرنیاں لکچر دیں گی کہ بچّوں کو اس طرح پالنا چاہیئے۔ جاپے میں یہ بات بُری ہے یہ اچھی۔ پھوہڑ عورتوں کو سلیقہ بتائیں گی۔

خالہ : سُنا ہے بازار بھی تو وہاں لگتا ہے۔

شمیمہ : ہاں خاصا میلہ سا سمجھو۔ کھانے پینے کی دکانیں ہوتی ہیں۔ کھلونے سلے سلائے

کپڑے۔ کتابیں اور الا بلا سب ہی کچھ بکتا ہے۔

خالہ: اوئی مردوئے بھی آتے ہیں؟

شمیمہ: مردوئے کیوں آنے لگے۔

خالہ: پھر سودے والے کون ہوتے ہیں۔

شمیمہ: عورتیں۔ ہر چیز عورتیں بیچتی ہیں۔

خالہ: اے ہے۔ یہ تو دیکھنے کی چیز ہے۔ بھئی میں بھی چلوں گی۔ ہزاروں میلے ٹھیلے گزر گئے جی ترستا ہی رہا۔ کون لے جاتا۔ کون دکھاتا۔ اب آخری وقت میں یہ تماشا دیکھ لوں۔

سلیمہ: (شمیمہ کی لڑکی) اے بی تم تو ہماری سیر بھی غارت کر دوگی۔ تمہیں کہاں کہاں کھینچتے پھریں گے۔ اپنے کو سنبھالیں گے یا تمہیں۔

خالہ: تم مجھے بس وہاں لے جا کر چھوڑ دینا۔ میں تمہارا ہاتھ نہیں پکڑنے کی۔

شمیمہ: خالہ! لڑکی کہتی تو ٹھیک ہے۔ ایسی بھیڑ بھڑکا میں تمہارا جانا ٹھیک نہیں۔

نعیمہ: (چھوٹی لڑکی) لیجئے۔ امّاں جان یہ پسی بھی جائیں گی۔ کہیں کچلی گئیں تو مزا آجائے گا۔

خالہ: میں خدا نہ کرے کیوں کچلی جانے لگی۔ دوسروں کو کچل کر نہ رکھ دوں تو کہنا۔ دیکھنا تم سب سے دو قدم آگے ہی رہوں گی۔

نعیمہ: رہ چکیں۔ اپنی کوٹھڑی سے دالان تک آتے آتے تو سو ہچکولے کھاتی ہیں۔

خالہ: خیر بی تم نہ لے جاؤ۔ میری سلیمہ لے جائے گی

سلیمہ: خالہ لے چلنے کو تو میں چلتی ہوں مگر میں جو کہوں وہ کرنا ہوگا۔

خالہ: سر آنکھوں سے۔

سلیمہ: تو پھر اچھا سا جوڑا پہن کر تیار ہو جاؤ۔ تانگہ آنے والا ہے۔

خالہ نے اپنی کوٹھڑی میں پہنچ جلدی جلدی بقچی کھولی۔ کپڑے ٹٹولنے شروع کیے لڑکیاں بھی آکھڑی ہوئیں۔ کوئی سبز سوسی کا پاجامہ پہننے کو کہتی ہے کوئی اودی دریائی کا۔ کسی نے چکن کا دوپٹہ کھینچا کہ یہ اوڑھ کر چلنا۔ کسی نے زرد اودی چادرہ کھینچا کہ خالہ کو یہ خوب پھبتا ہے۔ اتنے میں تانگے والا غل مچانے لگا۔ سلیمہ نے اپنا ایک مشروع کا غرارہ دیا اور نعیمہ نے اپنی بوٹی دار مخمل کی صدری۔ ماں دالان میں بیٹھی ہاں ہاں کرتی رہیں۔ مگر لڑکیوں نے یہی جوڑا پہنا اور بڑھیا کو گڑیا بنا تانگے میں جا بٹھایا۔ رستے بھر خالہ تانگے والے سے لڑتی، گھوڑے کو کوستی لڑکیوں کو ہنساتی رہیں۔ شیخ منگو کے چھتے سے پردہ باغ تھا ہی کتنی دور۔ دس منٹ میں تانگہ نمائش کے دروازے پر جا کھڑا ہوا۔

خالہ: (تانگے والے سے) ارے جوانا مرگ۔ یہ مردوں میں تانگہ کہاں کھڑا کر لیا۔ پردہ باغ کیوں نہیں چلتا۔

نعیمہ: خالہ، پردہ باغ یہی تو ہے۔

خالہ: جھٹکی پڑے۔ سڑک ہے یا پردہ باغ۔ سینکڑوں تانگے کھڑے ہیں۔

سلیمہ: اب اترو گی بھی؟

خالہ: اوئی بوا مردوں میں؟

نعیمہ: برقع کس لیے لائی ہو۔ سر پر ڈال لو۔ یہاں کا پردہ تو ایسا ہی ہے۔

خالہ: بیٹی یہ تو اچھی بات نہیں۔ دیکھو لوگ کیسی ٹکٹکی باندھے گھور رہے ہیں۔

سلیمہ: گھورنے دو۔ ان ہی کی آنکھیں پھوٹیں گی

خالہ: الٰہی دیکھنے والے تیرے دیدے پٹم ہوں۔

سلیمہ : آؤ۔ ذرا سنبھل کر اترو۔ بسم اللہ کہیں دھما نہ ہو جائے۔
خالہ : بھئی بولاؤ تو نہیں۔ مجھے اچھی طرح چاروں طرف سے بدن تو ڈھانک لینے دو۔
نعیمہ : ارے بی۔ اب تمہارا کوئی کیا دیکھے گا۔ بڑھیا پھونس تو ہو۔
خالہ : لو اور سنو لڑکی کی باتیں۔ آج بڑھیا ہو گئی تو کیا ہوا۔ کبھی تو جوان تھی۔
لڑکیوں نے قہقہہ لگایا۔ تانگے والا بھی ہنسنے لگا۔ محلے ہی کا لڑکا تھا۔ خالہ ہم نے تو تمہیں بڑھیا ہی دیکھا۔
خالہ : چل تو تانگ برابر کا لونڈا۔ مجھے کیا دیکھتا۔ اچھا تو کیا میں ماں کے پیٹ سے بڑھیا پیدا ہوئی تھی۔
نعیمہ : اے بی۔ یہ کون کہتا ہے۔ مگر اب تو تم حریرہ ہو۔
تانگے والا : چھوٹی بیگم! خالہ کا دل تو بارہ برس کا ہے۔
خالہ : اللہ تیرا بھلا کرے ..... نگوڑے ذرا میرا ہاتھ تو پکڑ۔ مُوا تانگہ ہے کہ قطب صاحب کی لاٹھ۔
تانگے سے اتر کر چلے تو ٹکٹ کا مرحلہ پیش آیا۔ ایسے موقعوں پر مرد اپنا نظام قایم نہیں رکھ سکتے۔ یہ جانتے بوجھتے کہ ٹکٹ دینے والے برابر ٹکٹ دے رہے ہیں اور آگے والے جب ٹکٹ لے چکیں گے تو پیچھے والوں کا وار آئے گا دھکا پیل سے باز نہیں آتے۔ ہر ایک یہ چاہتا ہے کہ پہلے مجھے ٹکٹ ملے۔ اس سے چپقلش پیدا ہوتی ہے۔ یہاں عورتوں کا بھی یہی حال تھا۔ ایک پر ایک گری پڑتی تھی۔ پھر آپس میں تو تو میں میں، وہ غل وہ اودھم کہ اللہ کی پناہ۔ وہ تو خالہ کو ایک عورت کے پاس کونے میں کھڑا کر دیا تھا نہیں تو خدا جانے ان کا کیا لکھا پورا ہوتا۔ ٹکٹ کی مہم خدا خدا کر کے آسان ہوئی تو اب دروازے میں سے گزرنا بھی کارے دارد۔ بھیڑ میں لوگ خوب

اپنی طاقتیں آزماتے ہیں۔ ہاتھوں سے دھکے دینا۔ کہنیوں سے رستہ بنانا۔ پاؤں سے دوسرے کے پاؤں کچلنا بہادری کا کام سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ زندگی اس قسم کی زندہ دلی کے بغیر زندگی ہی نہیں سمجھی جاتی۔

اندر داخل ہونے کے لیے جو رستہ بنایا گیا تھا ایک تنگ گلی سی تھی۔ بھیڑ کو دیکھ کر تینوں لڑکیوں نے خالہ رحمت کو اپنے بیچ میں لے لیا مگر دھکے ٹکے سے کیوں کر بچتیں۔ پیچھے سے ریلا آیا اور ایک دوسرے پر گر رہی ـــ خالہ کی کبھی جوتی رہ گئی کبھی ہاتھ چھوٹ گیا چادرے کا پلّا لٹکا جاتا ہے۔ برقع کئی دفعہ سر سے اتر گیا۔ ہانپی جاتی ہیں۔ سانس پیٹ میں سماتا نہیں ٹانگیں کام نہیں دیتیں۔ زبان قابو سے باہر۔ بھٹو کا لگا اور چلائیں۔ "شفقتی دیکھ کر نہیں چلتی۔ اُچھال چھکا کے آگے کی پھوٹ گئی ہیں۔ شپیتی کو دیکھا میرا پاؤں کچل دیا۔ ٹھہر تو تیرا سارا مٹکنا نکالوں۔

ریل پیل کرتی ٹکٹ لینے والی کے پاس پہنچیں۔ خالہ آگے تھیں اور ان کا ٹکٹ سلیمہ کے پاس۔ اس نے بڑی بی کو ہاتھ سے روک کر کہا "بڑھیا تیرا ٹکٹ ؟ خالہ کو اتنا سننے کی تاب کہاں تھی۔ بیچاری کے لتے لے ڈالے کہ بڑھیا ہوگی تیری میّا! اری ٹکٹ کیسا۔ یہ بھی کوئی ریل گاڑی ہے۔ اپنا منہ تو دیکھ بندریا کا سا۔ مجھے بڑھیا کہتی ہے۔ میں بڑھیا ہوں ؟"

عورتوں نے قہقہہ لگایا۔ ٹکٹ والی بھی بپھر گئی۔ وہ تو دونوں لڑکیاں جلدی سے پہنچ گئیں معاملہ رفع دفع ہوا ورنہ خالہ نے تو سارا مزا ہی کرکرا کر دیا تھا۔

اب اندر داخل ہوئے۔ نمائش کی چہل پہل اور بہار دیکھ کر خالہ کے دیدے پھٹے جاتے تھے۔ منہ پھاڑے ہر طرف دیکھ رہی تھیں۔ ایک ایک عورت کا بناؤ سنگھار۔ ان کی چال ڈھال پر آنکھیں گڑی جاتی تھیں۔ لڑکیوں نے کہہ سن کر ان کا برقع اتروایا کہ "بی بہ برقع اتار ڈالو۔ یہاں کون مردوئے ہیں جن سے چھپتی ہو" برقع اتارنا تھا کہ خالہ تماشا بن گئیں۔ جو اُن کا حلیہ دیکھتا ہنستا

ایک کہتی۔ بُوا بڑھیا کو دیکھنا کیا زور کا غرارہ پہنا ہے۔

دوسری: اور کمری بھی دیکھی کیسی بھڑک دار اڑائی ہے۔

تیسری: چادرہ تو ملاحظہ ہو۔

چوتھی: بہن۔ یہ پُرانے زمانے کی عورتیں اپنا دل نہیں مارتیں۔

پانچویں: مگر یہ سب باتیں عمر سے اچھی معلوم ہوتی ہیں۔

چھٹی: بُوڑھے منہ مُہاسے لوگ چلے تماشے۔

خالہ اتنی باتیں سُنتیں اور چپ رہتیں۔ تمتما کر بولیں "تمہاری آنکھوں میں خاک۔ تم کیوں جلی مرتی ہو۔ خدا دے تو کیوں نہ پہنیں اوڑھیں۔

ایک عیسائی عورت (مسکرا کر) ہاں بڑی مائی۔ تم نمائش کی سیر دیکھو انہیں پکنے دو (سلیمہ سے) کیوں بہن ان کے مالک زندہ ہوں گے۔

خالہ: اری مالک کون۔ میں جو زندہ ہوں۔

ایک عورت: ارے بڑھیا کو کیوں چھیڑتے ہو۔ یہ تو سچی زندگی کا نمونہ ہے۔ اس سے سبق لو۔

یہ نوک جھوک ہو رہی تھی کہ سامنے کے درخت پر سے گانے بجانے کی آواز آنے لگی۔ گراموفون بج رہا تھا اور درختوں پر لاؤڈ سپیکر لگے ہوئے تھے۔ خالہ نے ہکا بکا ہو کر درخت کی طرف دیکھا اور جلدی سے برقع اوڑھ لیا۔

نعیمہ: ہائیں خالہ خیر تو ہے۔ منہ کیوں چھپایا۔

خالہ: واہ بی واہ۔ خوب تم نے خالہ نگوڑی کے سفید چونڈے پر کالک لگائی

سلیمہ: ہوا کیا کہو تو؟

خالہ: کہوں کیا مردوں میں لے آئیں۔ میری شامت کہ تمہارے بہکاوے میں آگئی۔

نعیمہ: (اِدھر اُدھر دیکھ کر) ارے بی یہاں مرد کہاں۔ یہاں دس برس کے لڑکے کے آنے کا تو حکم ہے نہیں۔ تمہارا تو کچھ دل چل گیا ہے۔

خالہ: لو اور سنو۔ میرا دل چل گیا ہے یا تمہارے دیدوں کا پانی ڈھل گیا ہے۔ سر کُھا تو مردوئے درختوں پر چڑھے گا، بجا رہے ہیں۔ اللہ رے تمہارا ہیاؤ۔

سلیمہ: (مسکرا کر) اور یہ جو اتنی عورتیں پھر رہی ہیں؟

خالہ: جب تم سیدزادیاں ہو کر نہیں شرماتیں تو اِن ننگ سریوں کا کیا ہے۔ باز آئی میں ایسی نمائش سے جہاں مردوے دیکھیں۔ میں تو ہوائی جہاز آتا ہے تو اپنی کوٹھڑی میں چلی جاتی ہوں تمہیں دکھائی دے یا نہ دے۔ یہ کیا مُوئے درخت پر کھٹولیاں باندھے بیٹھے باجہ بجا رہے ہیں۔

سلیمہ: پھر کیا ہے۔ وہ ہمیں کیا جانیں۔ دیکھتے ہیں تو دیکھنے دو۔

خالہ: لو اور سنو۔ اچھا بیٹی تمہیں نہ سہی مجھے تو ہے۔ تم شوق سے ان کے پاس درخت پر چڑھ جاؤ۔ ان کے سامنے ناچنے لگو میں کیا کروں۔ میرا ایسا دیدہ نہیں۔

نعیمہ: خالہ! تم بھی تماشے کی ہو۔ یہ بھی ایک رہی کہ مردوئے درختوں پر گا بجا رہے ہیں۔

سلیمہ: (متین صورت بنا کر) اور کیا شیطان ہیں؟

نعیمہ: آپا جان! آپ کو بھی کہاں مذاق سوجھا ہے (خالہ سے) خالہ! تم ان کی باتوں میں اپنی سیر کیوں مٹی کرتی ہو۔ یہاں مردوں کا کیا کام۔ برقع کی جالی میں سے اچھی طرح دیکھو۔

خالہ: پھر یہ کون گا رہا ہے۔ صاف مردوں کی آوازیں ہیں۔

نعیمہ: خالہ! یہ تو گراموفون باجہ ہے۔

خالہ: درخت پہ؟

نعیمہ: ہاں- اونچا منہ کرکے دیکھو. وہ باجے کا بڑا سا بھونپو درخت کی پھننگ پر بندھا ہوا نہیں معلوم ہوتا۔

خالہ: ہے تو سہی -مگر وہاں باجہ بجانے والا بھی تو کوئی ہوگا؟

سلیمہ: اب جواب دو. خالہ تمہاری سمجھ میں بھی کچھ آتا ہے- بغیر بجانے والے کے کہیں باجہ بجا کرتا ہے -

نعیمہ: آپا جان- خدا کے لئے زیادہ نہ ستاؤ.

خالہ: تو اب بتاتی کیوں نہیں۔

نعیمہ: ایک بجلی کا تار اس بھونپو میں لگا ہوا ہے اور اس تار کا ایک سرا نیچے باجے میں اٹکا دیا ہے. بس نیچے باجہ بجتا ہے اور تار کے ذریعے سے آواز بھونپو میں ہوکر ہم سب کو سنائی دیتی ہے. چلو میں تم کو وہ جگہ دکھلاؤں جہاں باجہ بج رہا ہے.

نعیمہ بڑی منت خوشامد سے خالہ کو اس چھوٹے سے خیمے میں لے گئی جہاں گراموفون بج رہا تھا اور دیر تک انہیں سمجھاتی رہیں، جب کہیں خالہ کو یقین آیا اور انہوں نے برقعہ اتارا

خالہ: (خیمے سے باہر آکر) افوہ رے حکمت. یہ انگریز بھی بڑے جائیا ہیں- میرے تو ہوش جاتے رہے- میں نگوڑی یہ کرتب کیا جانوں بال سفید ہو گئے. کبھی ایسی باتیں دیکھی نہ سنیں

نعیمہ: اچھا آؤ- اب نمائش کی تو سیر کرو. خاطر جمع رکھو. یہاں مردوا ور دوا کوئی نہیں.

سلیمہ: خالہ! پھوہڑ اور سگھڑ گھر بھی دیکھے؟

خالہ: کہاں؟

سلیمہ: تم جہاں کھڑی ہو. ذرا دیکھو.

خالہ: اوئی ننھے ننھے گھر ہیں- ایلو سچ مچ کسی پھوہڑ عورت کی کیا نقل اتاری ہے. انگنائی

ہے جیسے ڈلاؤ۔ خدا کی سنوار۔ جہاں تہاں کوڑا ہی کوڑا۔ کھانے کے برتنوں پر کیسی مکھیاں بھنک رہی ہیں۔ دیکھنا کیسے موٹے موٹے چوہے ہیں۔ کونے کونے میں کھندانے۔ پانی کے مٹکوں کا کیا ہڑا کیا ہے۔ پھپھوندی لگی ہوئی۔ ڈھانکنے کی بھی توفیق نہیں۔ ارے جھینگر بھنگے چیونٹیاں سب کا ہیچمیل اچار ڈالا ہے۔ بھئی تو یہ۔ بڑا ہی زرغل گھر ہے۔

نعیمہ: ہاں خالہ۔ یہی تو دکھایا ہے کہ ایسی کاہل اور پھوہڑ عورتیں جن کے گھر کا یہ حال ہو وہ کس طرح اپنی اولاد کو سلیقے سے پال سکتی ہیں۔

خالہ: اے بھئی دیکھنے والوں کو گھن آتی ہے۔

سلیمہ: دیکھنے والوں کو گھن آئے یا نہ آئے۔ ایسے گھروں میں بیماریاں جو رات دن مہمان رہتی ہیں۔ بیماریوں کو گندگی سے خاص محبت ہے۔ چوہے طاعون کے دلال ہیں۔ مکھیاں ہیضے کو اور مچھر بخاروں کو بلاتے ہیں۔ دیکھا نہیں غلاظت پھیلی ہوئی ہے اور گھر والی سر باندھے میلے چکیلے کپڑے پہنے الگ کھٹیا پر پڑی ہے۔

خالہ: مگر پاس والا گھر تو کسی سگھڑ کا ہے۔ کیسی چندن سی انگنائی۔ ہر چیز اپنے ٹھکانے سے۔ اُجلے بچھونے۔ چارپائیاں کسی ہوئی۔ سب پر پلنگ پوش۔ گھڑونچی پر مٹکے۔ لٹکنوں پر صراحیاں۔ سب صاف ستھرے۔ اُجلی صافیاں بندھی ہوئی۔ جو دیکھے اس کا بیٹھنے کو جی چاہے

نعیمہ: پھر دیکھو اس گھر کے بچے کیسے چونچال ہیں اور بیوی بھی بیگم بنی بیٹھی بغچی کھولے کچھ سی رہی ہے۔

سلیمہ: چلتی چلو۔ اتنی اتنی دیر ایک ایک جگہ لگاؤ گی تو ساری نمائش دیکھ چکیں۔

خالہ: اے یہاں کیا تماشا ہے۔ عورتیں ہلی پڑتی ہیں؟

سلیمہ: زچہ خانہ دکھایا ہے۔ بڑی طبیبہ صاحبہ زچہ بچہ کے متعلق لکچر دے رہی ہیں۔

خالہ: لو یہاں بچّے بھی ہونے لگے۔

سلیمہ: ارے بی بچّے کیوں ہونے لگے، زچّہ کا کمرہ بنایا ہے۔

خالہ: کمرہ بنانے سے کیا فائدہ؟

سلیمہ: مطلب یہ ہے کہ زچّہ کے لیے ایسی جگہ ہونی چاہئے۔ آگے بڑھ کر سُن لو۔ طبیبہ صاحبہ سب باتیں بتا رہی ہیں۔

طبیبہ: بہنو! زچّہ کا کمرہ ہمیشہ نہایت صاف، ہوادار اور روشن ہونا چاہئے۔ کوئی فضول سامان وہاں نہ رکھو۔ زچّہ کے پاس زیادہ جمگھٹا نہ رہے۔ کپڑے بالکل صاف ستھرے ہوں۔ بچّے کے پوتڑے، نہالچے خوب صابن سے دھوئے جائیں۔ گندگی سے زچّہ اور بچّہ دونوں کی جان کا خطرہ ہے۔ کمیٹی نے لائق لائق دائیاں تمہارے لئے نوکر رکھی ہیں۔ ہر محلّے میں شفاخانہ کھلا ہوا ہے۔ جاہل دائیوں کے بدلے ان سے مدد لو۔ خرچ بھی کم ہوگا اور تمہاری نگرانی بھی باقاعدہ کی جائے گی۔

خالہ: (طبیبہ صاحبہ کی طرف آگے بڑھ کر) یہ کمرہ تو آپ نے خوب اچھا بنایا ہے مگر سب کو ایسے مکان کہاں نصیب۔ سرکار نے دائیاں تو مقرر کر دیں جگہ کا بھی بندوبست کر دیا کرے۔

طبیبہ: بڑی بی! جس کے گھر میں جاپے کا بندوبست نہیں وہ سرکاری شفاخانے میں جائے۔ دوسرے صاف ستھرے رہنے یا مکان کو صاف ستھرا رکھنے میں تو کچھ خرچ نہیں ہوتا

نعیمہ: (ہاتھ پکڑ کر) آؤ خالہ آگے چلیں۔

خالہ: (ایک دکان پر رُک کر) کسی چوڑی والی کی دکان ہے۔ کیسی کیسی خوبصورت چوڑیاں ہیں۔ نہ پہننے والی کا بھی جی بھر بھرا جائے۔

نعیمہ: معلوم ہوا تمہارا دل بھی بھر بھرا رہا ہے۔

خالہ : (ٹھنڈا سانس لے کر) نہیں بیٹی! میں اب چوڑیاں کیا پہنوں گی۔

سلیمہ : واہ۔ ابھی تو چوڑیاں پہننے کا زمانہ ہے۔ اے بی منہیاری! ذرا وہ سُرخ لچھا اُٹھا کر دینا۔

منہیاری : لو بیوی دیکھو۔ اس میل کی بس یہی رہ گئی ہیں۔

خالہ : رنگت کیسی پیاری ہے۔ آنکھوں میں کھُبی جاتی ہے۔

سلیمہ : ہاں بی منہیاری کیا دام ہیں۔

منہیاری : بیگم! داموں کا کیا ہے۔ پہن لو۔ جو چاہے دے دینا۔

سلیمہ : اچھا تو ہماری خالہ کو پہنا دو۔

خالہ : بیٹی تم پہنو۔ بہنوں کو پہناؤ۔ خدا ایسی ایسی لاکھ تمہیں پہننی نصیب کرے۔ میں پہنتی کیا اچھی معلوم ہوں گی۔

نعیمہ : دیکھو بی۔ تم اقرار کر کے آئیں تھیں کہ جو کہیں گے وہ مانو گی۔

خالہ : تو بیٹی یہ بھی کوئی بات ہے۔ اتنی عورتوں میں میری ہنسی اڑوانی ہو تو کہہ دو۔

سلیمہ : ہنسی کون اڑائے گا۔ کسی کا دینا آتا ہے۔

منہیاری : (دوسروں سے فرصت پا کر) ہاں بیوی کسے پہناؤں۔

سلیمہ : اری بی تم بھی سٹھیا گئیں۔ ہماری خالہ کو پہناؤ اور کسے پہناؤ گی۔

منہیاری : (خالہ کا منہ دیکھ کر) ان بڑی بی کو؟

خالہ : بڑی بی ہوں گے تیرے ہوتے سوتے۔ ہمارا ہاتھ تکنے والی بھی ہمیں بڑی بی کہتی ہے۔ خدا کی شان۔ ارے بڑی بی تو نے دیکھی بی ہے میں کوئی اندھی ہوں کبڑی ہوں میرا سر ہلتا ہے۔ آخر تو نے مجھے کس بات سے بڑی بی جانا۔

منہیاری کو پہلے تو بُرا معلوم ہُوا۔ وہ بھی جواب دینے کو تھی کہ لڑکیوں نے اشارہ کر دیا۔ وہ بھی ہنسنے لگی اور بولی

"اچھا آؤ جوان بی۔ خفا کیوں ہوتی ہو۔ چمڑے کی زبان ہے پھسل گئی۔

سلیمہ: واہ بی اچھی چمڑے کی زبان ہے۔ پہلے تو ہماری خالہ کو کوس لیا۔ اب خوشامد کرتی ہو۔

منہیاری: بیوی خطا ہوئی۔ معاف کر دو۔ کیوں خالہ کے کے چوڑیاں پہنو گی۔

سلیمہ: ان سے کیا پوچھتی ہو۔ جتنی اچھی لگیں پہنا دو۔

خالہ: بھئی۔ آج تم میرا پورا تماشا ہی بنا کر چھوڑو گی۔ کر لو اپنی ضد پوری (اور ہاتھ بڑھا دیتی ہیں)

خالہ نے سفید لگلا سے بالوں پر جھریائے ہوئے ہاتھوں میں لال لال چوڑیاں پہنیں تو دکان پر جتنی عورتیں کھڑی تھیں کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

خالہ: یہ آبخورے کہاں پھوٹنے لگے۔ کیا کوئی ننگا ناچ رہا ہے۔

اب اِدھر تو لڑکیاں بالیاں پھبتیاں اڑا رہی ہیں۔ کوئی کہتی ہے۔ "بوڑھی گھوڑی لال لگام سنتے چلے آئے تھے۔ دیکھنے میں آج آئی ہے۔" کسی نے کہا" خاصی آپا دیوانی معلوم ہوتی ہیں۔" جو زیادہ شوخ تھی اس نے آواز لگائی "لال مرغا چوٹی سفید مرغا ہڑپ" اور ادھر خالہ آئیں تو جائیں کہاں۔ وہ نئے نئے کوسنے دیے کہ نمائش میں ایک نئی نمائش ہو گئی۔

خدا خدا کر کے خالہ کو لے کر لڑکیاں آگے بڑھیں تو کہیں جا کر یہ چخ کم ہوئی۔ اب ایک کھلونوں کی دکان آئی۔

نعیمہ: خالہ۔ کھلونے دیکھیے۔ کیسی کیسی نئی وضع کے ہیں۔

خالہ: بیٹی! دنیا ہی نئی وضع کی ہو گئی ہے۔ جیسے کھیلنے والے ویسے کھلونے۔ ہمارے وقتوں میں یہ چیزیں کب تھیں۔ لے دے کر کپڑے کی گڑیاں اور ٹین یا مٹی کے کھلونے۔ یہاں تو ایک ایک کھلونا ایسا ہے کہ جی چاہتا ہے کلیجے سے لگا لوں۔ کیا گورے گورے پیارے پیارے بچے ہیں۔ بس ایک جان کی کسر ہے۔

سلیمہ: پھر کیا ارادہ ہے۔ ایک بچہ تم بھی لے لو۔

خالہ: مجھ کو تم نے کوئی سٹرن سمجھا ہے۔

سلیمہ: خالہ آخر اس میں سٹرن کی کیا بات ہے۔

خالہ: اتنی ہنسی اڑوا کر ابھی صبر نہیں آیا۔

سلیمہ: کوئی ہنسا تو اپنے منہ۔ تمہارا کیا بگڑا۔

خالہ: ہاں بھئی۔ میرا کچھ نہیں بگڑا۔

نعیمہ: تم نے بھی سب کو خوب سُنا لیں۔

خالہ: میری زبان کیا کوکو لے گئی تھی۔ وہ مجھے کہتیں اور میں چپ رہتی واہ واہ۔

سلیمہ: اچھا کھلونا نہیں لیتیں تو نہ لو۔ اب یہاں کیوں جم گئیں۔ آؤ سامنے دہی بڑے والی کی دکان پر چاٹ کھائیں۔

نعیمہ: کیوں خالہ کھاؤ گی نا۔

سلیمہ: منہ میں تو پانی بھر آیا ہو گا؟

خالہ: اچھا تو پھر کھاؤ۔ میں بھی چکھ لوں گی۔

سلیمہ: پہلے خالہ کو دو۔

خالہ: نہیں بیٹی تم لے لو۔

نعیمہ: ہم اتنی مرچیں کب کھا سکتے ہیں۔ تم ہی کو ہوکا رہتا ہے کہ چٹ پٹا ہو۔ اس میں مسالہ ذرا زیادہ ڈلوایا ہے۔

خالہ: (ایک پکوڑی میں منہ میں رکھ کر) ہے ہے۔ اری قطالہ تو بھی لڑکیوں کے بہکائے میں آگئی۔ اری مرچیں سی مرچیں جھونکی ہیں آگ لگ گئی۔

دہی بڑے والی، دیکھو جی اس بڑھیا کو سمجھا لو۔ ہمیں کاہے کو گالیاں دے رہی ہے۔

خالہ: اور کسے گالیاں دیں۔ تو نے میرے مارنے کا ارادہ کر لیا۔

سلیمہ: خالہ کیا ہوا۔ کیا مرچیں زیادہ پڑ گئیں؟

خالہ: بس بی رہنے دو۔

نعیمہ: خالہ آج تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ بھولے سے کوئی چٹکی زیادہ پڑ گئی ہو گی۔

خالہ: بھولے سے کیسی۔ اس ماں زادی نے جان کر ڈالی ہے۔

سلیمہ: جان کر وہ بیچاری کیوں ڈالتی۔ کوئی اسے اپنے گاہک بگاڑنے ہیں۔ ادھر سے مرچوں کا حصہ نوچ کر پھینک دو۔ ذرا سا دہی اور ڈال دو۔

(دہی بڑے والی دہی ڈالتی ہے۔ نعیمہ آنکھ بچا کر ایک چٹکا نمک کا بُرک دیتی ہے۔)

خالہ (دہی بڑا منہ میں رکھ کر) کیوں ری پھر شرارت کی۔ ہے شرط کہ دونا تیرے منہ پر مار دوں۔

دہی بڑے والی، خوانچہ کے سارے دام دھروا لوں گی۔

سلیمہ: اب کیا بات ہوئی؟

خالہ: چکھ کر دیکھو۔ نمک زہر مار کر دیا۔ سارا منہ کٹ کر رہ گیا۔

سلیمہ : تم بھی تو غریب کو گھبرائے دیتی ہو۔ اچھا پھینک دو۔ اور لے لو۔

خالہ : اب کے کچھ اور کرم کرے گی۔ نہیں بھئی مجھے نہیں چاہئے۔ یہ تو میری کبھی کی سوکن نکل آئی۔

نعیمہ : خالہ کی تقدیر میں ہی دہی بڑے کھانے نہیں لکھے۔

خالہ : ہاں بیٹی! خالہ کے نصیب ہی ایسے ہیں۔

نعیمہ : آپا جلدی چلو۔ بچے دیکھے جا رہے ہیں۔ بھیڑ زیادہ ہو جائے گی تو بچوں کا تماشا رہ جائے گا۔

خالہ : اے کیا جنگرا سے بچے ہیں۔ نگوڑوں کو نظر نہ ہو جائے۔

سلیمہ : نظر کیوں ہونے لگی۔ دیکھو ان کی ماؤں کا دودھ کیسا اچھا ہے۔ کیسے تندرست ہیں۔ جو ہے ہنسے دیتا ہے۔ کیسی کلکاریاں مار رہے ہیں۔

خالہ : ہم بھئی سچ تو ہے اور اس دھینوری کو بھی دیکھا۔ رنگت کیسی چمکدار ہے اوئی اتنی سی جان نے برابر والے کا کھلونا کیا جھپٹ کر چھینا ہے۔

نعیمہ : یہی لڑکی تو اول نمبر رہی ہے۔

خالہ : یہ کالی کلوٹی بینگن لوٹے۔ اس کی کون سی آن اچھی معلوم ہوئی ہے۔

نعیمہ : اس کی تندرستی۔ اس کی ماں کا رکھ رکھاؤ۔

خالہ : کیا کوئی صورت شکل والا بچہ ایسا نہیں۔ میں انعام دینے والی ہوتی تو کبھی اسے انعام نہ دیتی۔

سلیمہ : خالہ انعام تندرستی کا ہے۔ نہ خوبصورتی کا نہیں۔ خوب صورت بچے والیاں اپنی اور اپنے بچوں کی تندرستی کا کیوں خیال نہیں رکھتیں۔ وہ تدبیریں کیوں نہیں کرتیں جن سے آپ

بھی اچھی رہیں اور بچے بھی۔

ایک طبیبہ: (جو پاس کھڑی تھی) بیوی بچوں کی تندرستی ماؤں کی تندرستی پر منحصر ہے۔ تندرست ماں باپ کے بچے ہمیشہ تندرست ہوتے ہیں۔ حاملہ ہونے کے بعد عورت کو اپنی حفاظت کرنی چاہیئے۔ جاپے میں صفائی ستھرائی کا خیال رکھیں۔ بچہ ہونے کے بعد دودھ کا باقاعدہ انتظام ہو۔ ضروری نگرانی کی جائے۔ اِن احتیاطوں سے بچے تندرست رہتے ہیں اور ماں باپ کو زندگی بھر ان سے سکھ ملتا ہے۔

سلیمہ: سُنا خالہ؟

خالہ: بیٹی یہ باتیں تو تمہارے سننے کی ہیں۔ میں نگوڑی ناٹھی سُن کر کیا کروں گی۔ میں تو جیسی ماں کے پیٹ سے نکلی تھی ویسی ہی چلی جاؤں گی۔

لڑکیاں جھینپ جاتی ہیں۔ انعامات تقسیم ہوتے ہیں۔ تالیاں بجتی ہیں۔ نمائش کا وقت ختم ہونے کو ہے۔ بیویاں اپنے اپنے گھر جانی شروع ہوگیئں۔ میر صاحب کی لڑکیاں بھی خالہ کو لے کر بڑی مشکل سے باہر آئیں۔ تانگے میں بیٹھیں اور روانہ ہوئیں۔

نواب گُلدم

نواب عظیم الشان کے پوتے نواب ظلّ السلطان کو نواب ظلّ السلطان کہو تو دلّی کے لوگ منہ دیکھنے لگیں، ہاں نواب گُلدم کہو تو جھٹ پہچان جائیں۔ نام لیتے ہی تصویر سامنے آجائے۔ پنج گوشیہ مخمل کی کرن لگی ہوئی ٹوپی سر پر، ململ کا ٹخنوں تک کا انگرکھا اس پر جامہ دار کی نیمہ آستین، آڑا پاجامہ۔ مغلئی ڈاڑھی، مدرا قد، چھوٹی سی توند، گورا رنگ جھریائے ہوئے بال۔ شانوں تک پٹھے۔ انگلیوں میں کئی کئی انگوٹھیاں۔ ٹھمک چال۔ اپنی وضع کے شہر بھر میں اکیلے، عاشق مزاج، صوفیوں کا کھلونا۔ قوّالوں کی محفل کا تماشا۔ ناچ گانے کا چسکا ایسا کہ جہاں طبلے کی کھڑک سُنی بوٹی بوٹی پھڑکنے لگی۔ چاوڑی بازار کے ہر کوٹھے پر ان کے ہائے ہائے کے نعرے سُن لیجئے۔ شاعری کے نشے میں اتنے چور کہ جہاں دیکھو کھڑے گنگنا رہے ہیں۔ جس مشاعرے میں نواب گُلدم نہیں بے رونق۔

نواب گُلدم کیا تھے رنگ محل کا ایک طاق یا آثارِ قدیمہ کی ایک رنگین یادگار تھے۔ نوابوں کی اولاد کمانے سے بے فکر، عشق کی گود میں پلے ہوئے، حُسن کی پُتلیوں کا تماشا دیکھنے والے، بچپن سے مزاج میں وارفتگی، شادی کرکے عشق کے جذبات کی توہین کرتے۔ بال بچّوں کا جنجال پالتے تو حسینوں کی قدر کون کرتا، حُسن کی منڈی سونی نہ ہو جاتی؟ وہ تو اتفاق سے طبیعت کے کسی قدر میٹھے تھے۔ حسن و عشق کی ساری لذتیں صرف آنکھوں تک محدود تھیں ٹُک دیکھ لیا، دل شاد کیا، خوش وقت ہوئے اور چل نکلے۔ ورنہ سو روپے مہینے

کی آمدنی کیا ہوتی ہے۔ رئیسوں کی بازیوں کے سامنے سلطنتیں ہیچ ہیں۔ ایک ہی ریلے میں کھنڈر ہو کر رہ جاتے۔ میاں تانگہ چلاتے دکھائی دیتے یا کسی کا پاندان اٹھائے پھرتے

کالج کی زندگی بڑی آزاد ہوتی ہے۔ ہماری ٹولی کی بھی نواب گلدم سے یاد اللہ ہو گئی تھی۔ انہیں بننے کا شوق اور ہمیں بنانے کا۔ برسوں صحبت رہی۔ ایمان کی بات یہ ہے کہ آدمی مرنجان مرنج اور بے ضرر تھے۔ دردِ عشق کے سوا جھوٹا کھو یا سچا۔ ان میں کوئی عیب نہ تھا۔ کالج چھوٹا۔ معاش کی فکر ہوئی تو ان سے ملنا جلنا بھی کم ہو گیا۔ ایامِ جاہلیت کی یاد میں جب کہیں سرِ راہے گاہے ملاقات ہو جاتی دس پندرہ منٹ تک ایسا معلوم ہوتا کہ دنیا میں حسن و عشق ہی کی ساری رونق ہے۔ وہی ٹھنڈے ٹھنڈے سانسوں کے ساتھ ؎

نہ چھیڑ راکھ کو ہم دل جلوں کی بادِ صبا
ذرا ہوئی تہ و بالا دُھواں نکل آیا

کہہ کر ابتدائے کلام اور وہی کسی برقع پوش یا ساڑھی بند کے پیچھے آنسوؤں سے بھیگی ہوئی نظریں دوڑا کر ؎

بے مروّت ناوک افگن آفریں صد آفریں
دل کا دل زخمی کیا پیکاں کا پیکاں لے چلا

پڑھتے ہوئے یہ کہے سُنے روانہ ہو جانا۔ یہاں تک کہ اسی اثنا میں بہ سلسلہ ملازمت دلی کیا ہندوستان کو بھی مجھے چھوڑنا پڑا۔ پورے بیس برس کے بعد غلامی کی قید سے چھوٹ کر جو وطن آیا تو نہ اگلی سی زمین تھی نہ آسمان۔

صورتیں بدل گئیں۔ معاشرت کچھ کی کچھ ہو گئی۔ آدمی تو آدمی بازاروں، سڑکوں، مکانوں اینٹوں، پتھروں تک نے نیا رنگ روپ اختیار کر لیا۔ بدقسمتی سے میں پردیس بھی گیا تو یورپ

نہیں۔ غلام بھی رہا تو گوروں کی معرفت کالوں کا۔ اس لئے یہاں کا انقلاب کچھ اچھا نہیں معلوم ہوا۔ مغربی تہذیب مشرقی گھروں میں اوپری اوپری دکھائی دی۔

جوان گیا تھا اور بوڑھا ہو کر آیا تھا۔ وطن کی حالت میں بڑا انقلاب دیکھا۔ نہ پرانے طریق تھے نہ قدیم لباس۔ نہ مردوں کی بڑی بڑی مونچھیں تھیں نہ چڑھی ہوئی ڈاڑھیاں۔ نہ عورتوں کو سرمہ مسی مہندی کا شوق رہا تھا نہ زیورات سے گوندنی کی طرح لدنے لگا۔ اُدھر ڈاڑھی مونچھ غائب ہو گئی تھی تو ادھر چوٹی اور شرم۔ شہر کے باہر اس تمدنی انقلاب کے تماشے زیادہ دیکھنے میں آتے تھے۔ اس لیے میں صبح شام کی ہواخوری کا اکثر وقت روشن آرا باغ، قدسیہ باغ، نکلسن پارک میں یا دوسری طرف نئی دہلی کی سڑکوں پر گزارا کرتا تھا۔ ایک دن شاید روشن آرا کلب میں کوئی دعوت تھی۔ طرح طرح کے نوجوان مرد اور وضع وضع کی عورتیں جنہیں قومی لوگ خواتین اور دیویاں کہتے ہیں گاڑیوں، موٹروں میں اور کچھ زمین کو ٹھکراتی چلی آ رہی تھی۔ میں راستے سے ہٹ کر سامنے ایک بنچ پر جا بیٹھا اور ان پریوں کے تخت اترنے کی سیر دیکھنے لگا۔ کچھ فاصلے پر ایک بنچ بچھا ہوا تھا۔ جس پر ایک صاحب کوٹ پتلون میں ملفوف ننگے سر، آڑی مانگ نکلی ہوئی۔ ہیٹ قدم بوس، ڈاڑھی مونچھ صاف، عینک لگائے، نگاہوں میں بے تابی، چہرہ بے چین نظر آئے۔ آج کل کے فیشن کی اور خوبیاں تو جو ہوں گی وہ ہوں گی سب سے بڑی کرامت یہ ہے کہ مذہب اور عمر کی تمیز نہیں ہوتی بلکہ اگر دیکھنے والا لباس کی تفریق نہ کرے تو تذکیر و تانیث کا امتیاز بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ میں جب انہیں دیکھتا تھا دل میں ایک خاص قسم کی غیر معمولی کشش محسوس ہوتی تھی۔ ادھر بار بار ان کا عینک کی اوٹ میں میری طرف دیکھنا بتا رہا تھا کہ وہ بھی مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہے ہیں۔

اتنے میں دو تین گیسو بریدہ لڑکیاں خوش رنگ ساڑھیوں میں تیتریوں کی طرح اُڑتی

ہمارے قریب سے گذریں، میری نظریں تو قدرتی طور پر نیچی ہو گئیں۔ میرا مذاق ایسا اپ ٹوڈیٹ کہاں تھا کہ اس شباب کی آزادیوں اور حسن کی عریانیوں کی داد دیتا لیکن کیا دیکھتا ہوں کہ وہ صاحب یہ ایں فیشن بنچ کے تختے پر تھاپ لگا لگا کر نہایت سریلی آواز میں گا رہے ہیں ؎

نہ وہ حسن ہی میں ہیں شوخیاں نہ وہ عشق ہی میں گرمیاں
نہ وہ غزنوی کا مذاق ہے نہ وہ خم ہے زلفِ ایاز میں

باوجود ڈھلتی عمر کی افسردگیوں کے مجھے اپنے کالج کے زمانے کی شوخیاں یاد آگئیں۔ بے اختیار جی چاہا کہ ان حضرت کو ذرا بنانا چاہئے۔ یا تو یہ انتہا کے زندہ دل ہیں یا انہیں کوئی مہذّب بیماری ہے۔ کچھ بھی سہی وقت گزاری کا مشغلہ خاصا ہے۔ یہ سوچ کر میں ان کی طرف بڑھا۔ انہوں نے مجھے بغور دیکھا۔ جیبوں میں ہاتھ ڈالے اور نکالے۔ دو چار مرتبہ سر پر ہاتھ پھیرا۔ جیسے بھولی ہوئی بات کو یاد کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بے فکری کی وجہ سے میری صورت میں کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ اس کے سوا کہ پہلے تیس سال کا جوان تھا اب پچاس برس کا بوڑھا، کبھی ڈاڑھی نہ تھی آج مدبّر تھا اور ڈاڑھی بھی تل چاولی۔ میرے قریب جاتے ہی ان کا حافظہ تازہ ہو گیا۔ فوراً کھڑے ہو گئے اور ایک عجیب لے سے ؎

اسی باعث تو قتلِ عاشقاں سے منع کرتے تھے
اکیلے پھر رہے ہو یوسفِ بے کارواں ہو کر

گاتے ہوئے لپٹ گئے۔ اور کہنے لگے میاں صبوحی ہے ہے آنکھیں ترس گئیں۔ ایسے گئے کہ خط بھی نہ بھیجا رسید کا۔ آج یہ چاند کدھر سے نکل آیا۔ کہو بھائی کب آئے۔ کیسے ہو؟ اتنی دیر میں اب میں نے پہچانا کہ اخاہ! اس بہروپ میں ہمارے نواب گلدم ہیں۔ خوب بھینچ بھینچ کر گلے ملا۔ مگر حیران تھا کہ اس ٹھیٹھ دیسی آدمی پر انگریزیت کہاں سے سوار ہو گئی۔ یہ برزخ کیا بنا تی

ہے۔ کہیں بڑھاپے میں دماغ تو نہیں چل گیا۔ آخر نہ رہا گیا۔ مزاج پرسی کیسی مجھے سوال کرنا پڑا کہ حضرت یہ آپ اچھے خاصے انسان سے بندر کیسے بن گئے؟

نواب: بندر! یعنی؟

میں (ہنس کر) آپ تو پرانی قسم کے عاشق مزاج ہیں۔ میں تو سمجھا تھا کہ عشق کی آگ نے آپ کو چرمر کر کے رکھ دیا ہوگا اور ہمارے نواب گلدم کی روح یونان کی سرزمین۔ کنعان کے کاشانوں، مصر کے ایوانوں، کوہِ بیستوں، نجد کے بیابانوں یا پنجاب میں راوی کے کنارے کہیں بھٹکتی پھرتی ہوگی۔ لیکن میں دیکھتا ہوں کہ آپ ابھی زندہ ہیں اور زندہ بھی نئے چولے میں۔

نواب (مسکرا کر) ؎

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

کہیں دوسروں پہ مرنے والے خود مرا کرتے ہیں۔ عشق کی جوانی کے دن تو اب آئے ہیں

میں: واقعی۔ چشمِ بد دور۔ آپ کا حلیہ دیکھ کر کون آپ کو ستر بہترا کہہ سکتا ہے۔ البتہ تعجب یہ ہوتا ہے کہ آپ تو پیدائشی قدامت پسند تھے۔ جوانی میں کبھی اپنی وضع نہ بدلی ہمیشہ انگریزی لباس پر پھبتیاں اڑائیں۔ اب یہ فیشن کے دریا میں غوطہ کیسا؟

نواب (قہقہہ لگا کر) ؎

عشق ازیں بسیار کرد است و کند
سبحہ را زنّار کرد است و کند

یہی تو میری زندہ دلی کا راز اور زندگی کے آثار ہیں۔ اگر میں اس نئے دور میں اپنے عشق کی

چناں قحط سالے شد اندر دمشق
کہ یاراں فراموش کردند عشق

نواب: یہ آپ کی لاعلمی ہے۔ بھلا کوئی دلیل؟

نیس: اچھا آپ ہی فرمایئے مدّتوں سے کسی نے فرہاد کی طرح تیشہ مار کر جان دی ہے انا لیلیٰ لیلیٰ کہتا ہوا ہرنوں کی آنکھیں چومتا ہوا کوئی دکھائی دیا ہے۔ کتنوں نے تیغِ ابرو کی یاد میں اپنے گلوں پر چھریاں پھیری ہیں۔ آخر کہیں ہیر رانجھا کا قصہ دہرایا جاتا۔ کبھی تو عاشق کا جنازہ نکلتا

نواب: آپ میری آنکھوں سے دیکھیں۔ تھوڑی دیر کے لئے اپنا زاویۂ نگاہ بدل ڈالئے بندہ نواز اس دور میں پہلے سے بہت زیادہ عشق و عاشقی کا چرچا ہے۔ البتہ یہ مرض مہذب ضرور ہو گیا ہے۔ اگلے وقتوں میں اس بیماری کے دکھیا صدیوں میں دو چار پیدا ہوتے۔ آج جس نے سوٹ پہن لیا ہیٹ لگالی۔ ڈاڑھی مونچھ پر اُسترا پھیر دیا۔ چہرے پر ویسلین کو چپڑ لیا وہی عاشق ہے۔ کوئی ماں کے پیٹ ہی سے معصوم نکلا ہو یا فطرت ہی ناقص ہو تو اور بات ہے ورنہ جس کی پتلون کو ٹٹولئے گا عشق کے شعلے بھڑکتے نظر آئیں گے۔

نیس: لاحول ولا قوۃ۔ آپ کی باتیں بھی عجیب ہیں۔ آپ نے تو سرے سے عشق کا مفہوم ہی بدل دیا۔ موجودہ معاشرت سے مستفیض ہونے والا ہر شخص آپ کے نزدیک عاشق ہے۔

نواب: بھیّا! ناراض کیوں ہوتے ہو سے

عشق نے بدلا ہے جو رنگ وہ ہم سے پوچھو
آپ کیا جانیں غریب اگلے زمانے والے

ہمہ وقت عشق میں مبتلا رہنے کا پرانا طرز بدل گیا ہے۔ رات دن ایک معشوق کے تصوّر میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جانا آج کل کا فیشن نہیں۔ اب لوگ دوسرے مشاغل کی طرح عشق بھی

پرانی وضع نہ چھوڑتا اور زمانے کی چال کا ساتھ نہ دیتا تو واقعی کب کا ختم ہو گیا تھا۔

مَیں: کیا عشق بھی رنگ بدلتا رہتا ہے؟

نواب: عشق کوئی فرشتوں کی تو رسم نہیں کہ ازل سے ابد تک ایک ہی ڈھنگ پر رہے۔ یہ تو ہم دنیا والوں کا ایک کھیل ہے۔ جس طرح کبڈی، گلی ڈنڈا، گھتی پالا وغیرہ جدید تہذیب میں آکر ہاکی، فٹ بال، بلیرڈ اور گولف ہو گئے اسی طرح عشق نے بھی اپنا سانگ تھیٹر اور سینما میں تبدیل کر لیا۔ پھر عاشق تو اس اسٹیج کے ایکٹر ٹھہرے۔ وہ کیوں اپنا مذاق نہ بدل ڈالتے۔

مَیں: عاشق نہ ہوئے گرگٹ ہوئے۔ واہ بھئی۔ تو آپ کے نزدیک عشق بھی ایک کھیل ہے جذبہ نہیں۔

نواب: ارے میاں کیسی پرانی باتیں کرتے ہو۔ آج کل صحیح جذبہ وہ کہلاتا ہے جو وقت کے تابع ہو۔ آپ نے غور نہیں کیا۔ اب تیس پینتیس برس سے عشّاق کی وضع اور صفت میں بہت فرق ہو گیا ہے۔ آج کل عاشق کے لیے بہت ضروری ہے کہ وہ کم از کم گریجوایٹ ہو۔ فیشن ایبل ہو۔ انگریزی کے سوا کسی زبان میں بات نہ کرے۔ وہ دن لد گئے کہ عاشق اٹھواٹھی کھٹوائی لے کر پڑ جاتے تھے۔ حُب کے عمل پڑھتے تھے۔ گریباں چاک، سر پہ خاک ہائے واویلا مچاتے گلیوں کی ٹھوکریں یا لڑکوں کے پتّھر کھاتے پھرتے تھے۔ اب کوئی فطرت نگار افسانہ نویس یا مصوّر کردار ڈرامہ نگار کسی ایسے خدائی خوار دیوانے کو اپنے پلاٹ کا ہیرو بنا سکتا ہے۔ اُن کے شاہکار کا عاشق ہو یا معشوق اپ ٹو ڈیٹ نظر آئے گا۔

مَیں: اجی یہ تو سوشل باتیں ہیں۔ عشق کو ان سے کیا واسطہ؟ میں تو جانتا ہوں کہ بے روزگاری اور سرمایہ دار اور مزدور کی کش مکش نے عاشقی کا بازار ہی سرد کر دیا ہے۔

پورے ضابطہ اور وقت کی قدر کے ساتھ کرتے ہیں۔ وہ جو آپ نے سنا ہوگا کہ "دل بہ یار و دست بہ کار"۔ اُس کو اسی زمانے والوں نے سمجھا ہے۔ پرانے وقتوں کے عاشق تو احمق تھے جن کا قول تھا کہ ؎

عاشقی چیست بگو بندۂ جاناں بودن
دل بدستِ دگرے دادن و حیراں بودن

سبحان اللہ! یہ بھی انسانیت ہے۔ معشوق نہ ہو، بھوت ہو گیا کہ سر سے اترتا ہی نہیں۔ ہم بھی مدتوں اس حماقت میں مبتلا رہے اور نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم۔ نہ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے۔ آخر سمجھ گئے، زندگی نکل آئی۔ ملک میں اس سرے سے اُس سرے تک، نکل جائیے جہاں انگریزی تعلیم، انگریزی تمدن، انگریزی زندگی زیادہ رونق پر ہے اس قسم کے ہزاروں عاشق ملیں گے۔ دفاتر کے ملازم اپنا کام بھی کرتے ہیں اور عشق بھی۔ ملازمت اور پڑھنا لکھنا اپنی جگہ ہے اور یہ جذبہ اپنی جگہ۔ اِدھر قلم گھس کر اٹھے، مدرسہ بند ہوا اور عشق بازی کا نمبر آیا۔ تفریح گاہیں بارونق، سینما ہال آباد۔ بازاروں میں نگاہوں سے نگاہیں لڑ رہی ہیں۔ دوکانوں پر ٹینک ہینڈ ہو رہا ہے۔ کلبوں کے کمرے، چمن، موٹریں عشق کی دکانیں ہیں۔ یہ کاروبار عموماً رات کے گیارہ بارہ بجے تک ہوتا ہے۔ اس کے بعد حسن کا راستہ وہ اور عشق کا یہ۔ لیکن شرط یہ ہے کہ آزادی، لباس، وضع زمانے کے مطابق ہو۔ ذرا غدر پہلے کی بُو آئی اور پارہ پتھر بامر۔ رقابت پاکبازی اور مفلسی سے مزا کرکرا کیا ہوتا ہے بلکہ ایسے عیب داروں کو سوسائٹی میں کوئی گھسنے نہیں دیتا۔

مَیں: غضب الٰہی! آپ انہیں عاشق کہتے ہیں۔

نواب: اور کیا کہوں؟

مَیں : فاسق، بد نظرے ، رذیل ، کمینے

نواب : ماشاءاللہ (زور سے ہنس کر) بھائی کیا کہہ رہے ہو۔ عشق و فسق دو چیزیں ہیں؟

مَیں : اور تم عشق و فسق کو ایک سمجھتے ہو۔ توبہ توبہ!

نواب : ناراض نہ ہو۔ لغت میں عشق کے معنی کچھ اور تھے اور فسق کے کچھ اور۔ وہ مشرق اور مغرب کے ملانے والے سمندر میں ڈبو دی گیئں۔ اب تو ان دونوں لفظوں میں تفریق کرنے والا بیوقوف، جاہل اور اپنے عیش کا دشمن سمجھا جاتا ہے۔

مَیں : یہ کیوں نہیں کہتے کہ شیطان سمجھا جاتا ہے۔ اچھی عشق کی مٹی خراب کی ہے۔ اگر یہی عشق ہے تو اس کے کرنے والے سارے فاسق ہیں۔ لیکن نہیں ایسا نہیں ہوگا۔ ہمارا ملک ابھی ایک حد تک خاصا مذہبی ہے۔

نواب : نوجوانوں کو مذہب سے کیا کام۔ ان کا مذہب تو فیشن ہے۔ رہے ملک کے بڑے بوڑھے ان میں سے پچاس فی صدی کا خمیر تو اس ترشی سے اٹھا ہی نہیں۔ باقی سو میں سے پچاس پورے بگلا بھگت ہیں۔ انہوں نے تو مجازی کے ساتھ حقیقی کو بھی ملا لیا ہے۔ وہ فیشن کے بدلے اپنی وجاہت، اپنے اثرات، اپنی قومی نمود اور اپنے دینی یا دنیوی وقار سے کام لیتے ہیں۔

مَیں : بہر حال میں اور میں کیا کوئی بھی سمجھدار آدمی اس عشق کو فسق کہے بغیر نہیں رہ سکتا

نواب : اس خاص معاملے میں ایسے کسی شخص کو مَیں سمجھدار کہنے کو تیار نہیں جو وقت کو نہ پہچانے اور فضا کے مطابق اپنا مذاق نہ پیدا کر سکے۔ میں بحث کرنا تو نہیں چاہتا لیکن یہ سمجھ لو کہ عشق اور فسق میں تمیز کرنے والے تو سینکڑوں برس سے درگور یا درکتاب ہیں۔ آخری دور کی فارسی شاعری اور اردو میں معاملہ بندیوں نے یہ بھید آشکارا کر دیا۔ ہمارے ادب کا بہت سا سرمایہ بوالہوسی کے جذبات سے بھرا ہوا ہے۔ آج اگر آپ فسق اور عشق کا ڈانڈا الگ کرنا چاہیں

گے تو مجھے ڈر ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو آپ کو خانقاہوں میں بھی اسی نمونے کا عشق نظر آنے لگے۔

مَیں: مینڈکی کو بھی زکام ہوا۔ اب آپ مجازی کی ہنسی اڑاتے اڑاتے حقیقی پر بھی منہ آنے لگے ع

نہ چھیڑ ان دلق پوشوں کو کہ یہ اللہ والے ہیں

نواب: اندھے کے آگے روئیے اور اپنے نین کھوئیے۔ عشق و محبت کا فلسفہ آپ نے پڑھا ہی نہیں آپ کی سمجھ میں کیوں کر آئے۔ بندہ پرور! جب مجازی اپنے درجے سے گر کر فسق کی سطح پر آجاتا ہے تو حقیقت کی ساری راہیں بند ہو جاتی ہیں۔ صرف یہی دیکھا گیا ہے کہ ع

کان آہٹ پہ دل خلوت کا دیوانہ

اور اسی لئے ہمہ اوست کا مسئلہ گھڑ لیا گیا ہے۔

مَیں: نعوذ باللہ۔ کیا خرافات بکتے ہو۔ ایاز قدرِ خود بشناس۔

نواب: میں نے تو اپنی کیا اپنے سارے ملکی و قومی بھائیوں کی گٹ پٹ اور ہو حق کا اندازہ کر لیا ہے۔ سب امانت کی واسوخت کے مصرعے ہیں۔ ہارمونیم پر الاپے جائیں یا ڈھولک ستار پر۔ کلب کے کسی کمرے میں بیٹھ کر سنئے یا مقبرے کے گنبد میں کھڑے ہو کر۔

مَیں: اپنے ملک اور اپنی قوم پر تمہیں اتہام رکھتے شرم تو نہیں آتی۔

نواب: عشق میں اور شرم

مَیں: اچھا مسلمانوں پر تو رحم فرمائیے۔

نواب: مجھے آپ نے خدائی فوجدار سمجھا ہے۔ میں نے اپنا مشاہدہ بیان کیا ہے۔ رحم و ستم کا اس میں کیا دخل۔

مَیں: آپ کا مشاہدہ سہی یا تجربہ۔ میری رائے میں آپ کی آنکھوں اور آپ کے شوریدہ

خیالات نے آپ کو بہکا دیا ہے۔ مسلمان بیچاروں کو اپنے پیٹ سے ہی فرصت نہیں معاشقہ کیا کریں گے۔

نواب: پیر و مرشد۔ ایک یہی قوم تو ہے جو لنگوٹی میں پھاگ کھیلتی ہے۔ انہی فاقہ مستیوں کے دم سے آج تک عشق زندہ ہے ساری دنیا نون تیل لکڑی کا بھاؤ پوچھتی پھرتی ہے اور یہ زلفوں کے سودے میں۔ کوئی تجارت میں ترقی کر رہا ہے۔ ملازمت کے میدان سر ہو رہے ہیں۔ سیاسی گتھیاں سلجھائی جا رہی ہیں۔ مگر ان کی وضعداری میں کیا مقدور ہے کہ فرق آیا ہو وہی "بس اک نگاہ پہ ہے ٹھہرا معاملہ دل کا" وہی "سنگِ درِ بتاں سے تقدیر پھوڑتے ہیں" عاشقی ان کا پرانا فن ہے۔ اسے ترک کر کے بدمذاق کہلائیں۔ استاد ذوق نے خوب کہا ہے ؎

پھرتے ہیں لکھے پڑھے سوٹے میں ملک جا کے
طفلِ مکتب رہتے ہیں گنبد میں بسم اللہ کے

کھانے کو کچھ ہو یا نہ ہو۔ ٹوٹی جوتی۔ میلا پاجامہ۔ صورت پر پھٹکار سہی۔ معشوق کے بغیر زندگی نہیں البتہ مصیبت یہ آپڑی ہے کہ آج کل حسین چیل کی اولاد ہیں۔ سونے کی جب تک جوت نہ آئے آنکھیں نہیں کھلتیں۔ دل کو لے کر کوئی کیا کرے۔ ایک گوشت کا لوتھڑا۔ وہ بھی نیم بسمل۔ زخم خوردہ پاؤں کے نیچے مسلا ہوا۔ یہاں کھنکتی ہوئی جیبیں چاہیئں۔ سر سے پیر تک عاشق انگریزی سنگھار دان ہو۔

مِس: جبھی آپ نے یہ کینچلی بدلی ہے۔

نواب: آخر کیا کرتا۔ پرانے سکّے کے معشوق تو ٹکسال باہر کر دیے گئے۔ اُن کے بوڑھے غمزے کسی گنتی میں نہ رہے۔ حسن کا معیار دوسرا ہو گیا۔ نمائش کی ترکیب بدل گئی۔ میں اپنی عادت سے مجبور تھا۔ بیکاری میں عشق بازی سے زیادہ دلچسپ کون سا مشغلہ ہو سکتا ہے۔

پھر سفید ڈاڑھی اور بھنڈیلوں کی سی پوشاک۔ کوئی مجھ پر قہقہہ لگانا بھی گوارا نہ کرتا۔ ان تمام باتوں پر غور کرنے کے بعد ڈاڑھی مونچھ حجّام کے حوالے کی۔ پرانا لباس اتار یہ وضع اختیار کر لی تاکہ تہذیب جدید کے لحاظ سے سوسائٹی کے قابل بن جاؤں اور کسی خاتون یا دیوی کو مجھ سے شیک ہینڈ کرنے میں ناک بھوں نہ سکیڑنی پڑے۔ چنانچہ الحمدللہ جس طرف نکل جاتا ہوں، غیر جنس نہیں سمجھا جاتا۔ راستہ چلتے میرے ہاتھ سے اگر کسی کی ساڑھی الجھ جاتی ہے یا میں بے خیالی میں کسی سے ٹکرا جاتا ہوں تو وہ بجائے غضب آلود نگاہوں سے دیکھنے کے سوری (SORRY) کہتی ہے اور مسکرانے لگتی ہے۔ جوان سے جوان اور حسین سے حسین عورت کا سر بازار موٹر یا تانگے سے بچانے کے لیے ہاتھ پکڑ لیتا ہوں تو وہ ایک انداز کے ساتھ تھینک یو کہہ کر دیر تک میری طرف دیکھتی رہتی ہے۔

مَیں: آخاہ! چشم بد دور۔ اب تو آپ انگریزی بھی بولنے لگے۔

نواب: تہذیب یافتہ حسن کے لئے مہذّب عشق ہی ہونا چاہئے۔ حسن و عشق کی ہم رنگی و ہم آہنگی تو دراصل اس دور کی زندگی ہے۔ ایران کے کج کلاہ خسرو کی ملکہ اور ایک پتھر پھوڑ عاشق آج کل نہیں چل سکتا۔ حقیقت کچھ ہو یا نہ ہو۔ وضع قطع، بول چال سے جنٹلمین ثابت کرنے کی ضرورت ہے۔ ظاہری شان تو بازار میں بکتی ہے میں نے خرید لی۔ انگریزی پڑھنا مشکل تھا۔ نہ وقت نہ دل و دماغ۔ بس یہی سمجھ میں آیا کہ کچھ ایٹی کیٹ کے فقرے اور گنتی کے ضروری الفاظ یاد کر لیے جائیں حافظہ تو میرا آپ جانتے ہیں۔ شاعر ہوں۔ دیوان کے دیوان ازبر ہیں۔ بیت بازی میں شہر بھر کو چیلنج دینے کا دعویٰ ہے۔ چنانچہ سوسائٹی میں جتنے لفظ استعمال کئے جاتے ہیں، میں نے سیکھ لئے۔

مَیں: جیو! نواب گدم۔ تمہارا دم غنیمت ہے۔

نواب : کوئی دعا دے یا کوسے۔ میری عمر پچاس سال بڑھ گئی اور یہ سب جدید وضع کے عشق کا نتیجہ ہے۔ وہ ایک جگہ دل اٹکانا۔ دن بھر سر جھاڑ منہ پہاڑ۔ پھٹے حال بانکے دہاڑے جنگل سے شہر اور شہر سے جنگل میں وحشیوں کی طرح پھرنا۔ رات بھر ہائے کے نعرے لگا کر محلے والوں کی نیندیں خراب کرنا۔ رقیبوں کی کبھی خوشامد کبھی ان کی جان کا لاگو ہو جانا۔ در بدر کی ٹھوکریں کھانا۔ اونہوں۔ ایسی باتوں میں عمر کم ہوتی ہے اور ذلت و رسوائی گھاٹے میں۔ اب راوی چین ہی چین لکھتا ہے۔

ٹنّاں پہلوان

آج سے کوئی چالیس پینتالیس بلکہ پچاس برس پہلے لال کنوئیں کے بازار میں، قاسم جان کی گلی کے نکڑ پر چوکی بچھائے، سینی آگے رکھے ایک پستہ قد، کان ٹوٹے، سر منڈائے، چیچک منہ داغ، میلا سا تہمند باندھے عمر اترے ہوئے مکڑ کی صورت اُکڑوں بیٹھے آواز لگایا کرتے "مال کھاؤ تو آؤ۔ کھیر ہے ربڑی ربڑی ربڑی"۔ یہ آواز کچھ ایسا سارے جسم کا زور لگا لگا کر نکالتے کہ زمین سے بالشت بالشت بھر اُونچے ہو ہو جاتے۔ ان کا نام ٹنّاں پہلوان تھا۔

اُن دنوں شیخو والوں، نہر والوں، خورجی والوں وغیرہ کے نام سے کئی مشہور پرانے اکھاڑوں کے علاوہ دو نئے اکھاڑے بھی کھل گئے تھے۔ اُس وقت دلّی کے بعض رؤسا میں کسرت کا شوق باقی تھا۔ کشمیری دروازے نواب سلطان مرزا کے ہاں کسرت اور لڑنت ہوتی۔ نواب صاحب خود بھی اپنے لڑکوں سمیت لنگر لنگوٹا باندھے لڑنت کیا کرتے۔ اِدھر حکیم عبدالمجید خاں اور لہارو والے نواب احمد سعید خاں نے بلیماروں اور قاسم جان کی گلی میں دو اکھاڑے کھول رکھے تھے۔ ایک میں اُستاد انچھو لڑنت کراتے اور دوسرے میں اُستاد شہباز بیگ؛

دلّی میں صدیق، غلام، کیکر سنگھ جیسے پہلوان تو کبھی پیدا ہوئے نہیں، البتہ بھرتی اور پور پور پہ داؤں کرنے والے اس وقت تک اکثر تھے۔ پرانے پٹھوں میں نخولی نے توند نکال لی تھی۔ کلن جھول گیا تھا گھوسی والے اور شدّن گنتی بھی دونوں دنگلی نہیں رہے تھے۔ صرف انچھو اور شہباز بیگ نے حکیم اور نواب کے سہارے اپنی اپنی اُستادی کو سنبھال رکھا تھا

یا ایک آغا توبڑے کو سمجھو۔ اس نے بعض کشتیاں مار کر اپنی دھاک بٹھا رکھی تھی اسے اپنی کھوٹ پر بڑا ناز تھا اور واقعی اس کی پہلی جھپٹ شیر کی جھپٹ ہوتی۔ کھڑے ہوتے ہی اگر کا داؤں چل گیا تو اپنے سے دُگنے کو نیچے لے آتا۔ ورنہ سارے اکھاڑے میں ناچتا رہتا۔ چنانچہ جب پہلی مرتبہ غلام پہلوان دلّی میں آیا ہے اور دنگل میں اُتر کر خم ٹھونکے ہیں تو آغا توبڑا ہی تھا جس نے سامنے آ کر کہا ہے کہ پہلوان آؤ دو دو ہاتھ ہو جائیں۔ غلام اُس کی طرف تعجب سے دیکھنے لگا۔ کیونکہ یہ قد و قامت میں خاصا تھا مگر توند نکلی ہوئی اور جسم تھل تھل آغا بولا "پہلوان دیکھتے کیا ہو، ایک دفعہ تو میں تمہیں نیچے لے آؤں گا۔ اس کے بعد اگر تم چیت نہ ہوئے تو میں جانتا ہوں کہ تم میری ہڈی پسلی ایک کر دو گے۔ خیر جو کچھ بھی ہوا نام تو رہ جائے گا۔" غلام بڑا سمجھدار تھا۔ خیال کیا ہوگا کہ کہیں مرد کی موت نامرد کے ہاتھ نہ آ جائے اگر واقعی اس نے گرا لیا تو ساری شہرت خاک میں مل جائے گی۔ ہنس کر آغا کو گلے سے لگا لیا اور کہنے لگا "پہلوان تم ایسے ہی ہو۔ مگر میں فی الحال کشتی لڑنے نہیں آیا ہوں۔"

اس زمانے میں سال کے سال یہاں صرف دنگل بندھا کرتا تھا۔ نتھولی مل کا مدانی کا ایک کارخانہ دار یہ دنگل باندھا کرتا۔ زینت محل کے دروازے میں دو سہ دریاں تھیں۔ دروازے کے اندر گھستے ہوئے بائیں ہاتھ کی سہ دری میں نتھولی مل کی بیٹھک تھی اور وہیں کاریگر کام بھی کیا کرتے تھے۔ آغا توبڑے کا گھر چونکہ سامنے ہی چابک سواروں کی گلی میں تھا اس لئے دنگل کے سلسلے میں وہ اکثر نتھولی مل کے پاس آ بیٹھا کرتا

آغا چابک سواروں میں سے تھا۔ شاہزادوں کے مشہور اُستاد شہسوار خاں کو لوگ اس کا پردادا بتاتے تھے۔ کالے خاں مالے خاں کے دیکھنے والے تو اس وقت بھی ہوں گے قلعہ کی بربادی کے بعد مہاراجہ شودان سنگھ نے انہیں الور بلا لیا تھا۔ شودان سنگھ کے بعد

پٹیالے چلے گئے تھے۔ وہیں اُستادوں کی طرح رہے اور وہیں اُن کا انتقال ہوگیا۔

آغا کے بڑے بھائی پہلوان بھی تھے اور چابک بھی ہمیشہ اُن کی بغل یا ہاتھ میں رہتا۔ لیکن اب شہر میں ایسا کوئی رئیس تو رہا تھا نہیں جس کے ہاں زین سواری کے گھوڑے ہوتے اور انہیں اپنے لڑکوں کو شہسواری سکھوانے کی ضرورت پڑتی۔ اب آخری دور میں تین شخص گھوڑوں پر نکلتے تھے۔ حکیم محمود خاں۔ نواب احمد سعید خاں یا حکیم بدرالدین خاں۔ ان کے بعد حکیم عبدالمجید خاں اور حکیم واصل خاں کو جوڑی ہانکنے کا شوق ہوگیا تھا۔ اچھا تو آغا کا بھائی نہ کبھی دنگل میں اُترا نہ اُس نے غالباً کبھی چابک سواری کی۔ جو کوئی پوچھتا کہ بڑے آغا گھوڑا تو کبھی تمہاری ران کے نیچے دیکھا نہیں، چابک کیوں لئے پھرتے ہو تو کہہ دیتے میاں چابک سواری باپ دادا پر ختم ہوگئی اب تو چابک پر سوار ہوں۔ نتھو مل کے کارخانہ میں کامدانی بنایا کرتے یا دنگل کے موقع پر منتظم بن جاتے۔

دلّی والے اس وقت تک پچھڑنے کو عیب سمجھتے۔ اس لئے جب کبھی کسی دلّی والے نامی پہلوان کی کشتی ہوتی اکثر ملی ہوئی ہوتی یعنی یا تو باہر والا پچھڑ جاتا یا برابر چھڑا دی جاتی۔ آغا تو بڑے کی گزر اوقات یہی رہ گئی تھی۔ پہلے تو وہ بھی کامدانی کا کام کیا کرتا تھا لیکن اب کچھ مندے کے سبب اور کچھ ہاتھ پاؤں کے ڈھیر ہوجانے سے کشتی کی آمدنی ہی پر گزارہ تھا اور اس لئے ضرورت تھی کہ نتھو مل سے ساز باز رکھے۔

بتّاں پہلوان آغا تو بڑے کا چھوٹا بھائی تھا لیکن ہاتھ پاؤں ڈیل ڈول سے دونوں ایک ماں کے بیٹے ہی نہیں معلوم ہوتے تھے۔ یہ ٹینی وہ کلنگ۔ آدھ پئی اور سیر کا فرق۔ کچھ دن تو مارے باندھے کامدانی کا کام کیا پھر بھائی کی دیکھا دیکھی پہلوان بننے کی سوجھ گئی۔ بھائی سے چھپوا اُستاد انچھو کا شاگرد ہو کر حکیم جی کے اکھاڑے میں جانے لگا۔ اس لئے کہ وہاں سیر بھر

دودھ بھی روز پینے کو ملتا تھا۔

اکھاڑوں کی آپس میں ضد تو ہوا ہی کرتی ہے۔ ہر اُستاد دوسرے اُستاد کو نیچا دکھانا چاہتا ہے۔ برسات آئی دنگل ہوا۔ خدا جانے کیا موقع پیش آیا کہ اُستاد شہباز بیگ نے اُستاد انچھو کو دیکھ کر خم ٹھونک دیئے۔ نواب احمد سعید خاں اور حکیم عبدالمجید خاں بھی سامنے کرسیوں پر بیٹھے تھے اُسی وقت کشتی ٹھہر گئی۔ ہاتھ ملنے لگے۔ دونوں اُستاد۔ دونوں شہر کی ناک۔ خوب خوب اُستادیاں دکھائیں داؤں پیچ ہوتے ہوتے اُستاد آغا توبڑے پاس کھڑے تھے۔ اُنہوں نے نہیں معلوم کیا کہہ دیا کہ شہباز بیگ کا داؤں نہ چلا۔ بلکہ انچھو نے گھٹنے ٹیک شہباز بیگ پر سواری گانٹھ لی۔ نواب صاحب بگڑ کر کھڑے ہو گئے۔ حکیم جی کے لحاظ سے انچھو کو تو کچھ کہہ نہیں سکے آغا توبڑے پر برس پڑے۔ آغا توبڑا ایک مُنہ زور اور شہدا دو بہ دو کرنے کو تھا کہ لوگ بیچ میں آ گئے۔ بڑی مشکل سے نواب صاحب کے غصّہ کو ٹھنڈا کیا۔ آغا کو ہٹا کر دنگل سے باہر کیا۔ لیکن چونکہ اس معاملہ میں حکیم جی خاموش رہے تھے، اس لئے نواب صاحب نے دو چار لفظ ایسے بھی کہے جو حکیم جی پر چُست ہوتے تھے۔ چلئے دونوں میں چشمک ہو گئی۔

کچھ دن بعد اُستاد شہباز بیگ کا ایک پٹھا تیار ہو گیا اور ایک روز حکیم جی کے اکھاڑے میں نکل آیا۔ انچھو اپنے پٹھوں کو لڑنت کرا رہے تھے۔ ضدی کے پٹھے کو دیکھ کر کہیں انہوں نے کہہ دیا کہ اب خدا نے چاہا تو شہباز کے مقابلہ میں منّاں کو لاؤں گا۔ شہباز بیگ کے پٹھے کو یہ سُننے کی کہاں تاب تھی۔ فوراً اکھاڑے میں کود پڑا اور بولا "اُستاد آپ سے تو گستاخی کر نہیں کر سکتا۔ میں حاضر ہوں پہلے مجھ سے ہاتھ ملوا کر نہ دیکھ لو" اتنے میں حکیم واصل خاں تشریف لے آئے۔ منّاں ان کی مالش کیا کرتا تھا۔ صورت دیکھتے ہی یہ کہتا ہوا آیا کہ "یار گتی۔ بہت دن سے مجھے بھی آرزو تھی کہ میاں کے سامنے زور ہو جائیں" اکھاڑے میں کود خم ٹھونکنے لگا لیکن حکیم جی

کو کچھ خیال آگیا۔ کہنے لگے "بھئی آج مناسب نہیں۔ بھائی صاحب کی اجازت کے بغیر میری مرضی نہیں کہ یہ کشتی ہو۔

بھائی صاحب سے پوچھ لو۔ ادھر اُستاد انچھو بھی نواب صاحب کی اجازت لے لیں۔ پھر جو اکھاڑہ تجویز ہوا تو نواب صاحب کا یا ہمارا وہاں زور کیا جائے" گتی تو مان گیا۔ ٹنّاں ذرا اکڑا تو حکیم صاحب نے ڈانٹ دیا اور یہی ٹھیرا کہ کم از کم دونوں اُستادوں کی موجودگی میں یہ دونوں پٹھے لڑیں۔

انچھو کے دل میں بل تھا دوسرے ہی دن شہباز بیگ سے ٹنّاں اور گتی کی کشتی کا فیصلہ کر لیا۔ نواب صاحب سے اجازت مانگی تو انہوں نے کہا کہ ہمارے اکھاڑے میں ہو گی۔ میرے پہلوان کو قارورہ نہیں دکھانا کہ حکیموں کی گلی میں جائے۔

مختصر یہ کہ کشتی ٹھہر گئی اور دوسرے دن دونوں اکھاڑوں کے اُستاد اور شاگرد مرغے خانے کی گلی میں آگئے۔ حکیم صاحب بھی آ پہنچے اور نواب صاحب اُن کے پاس آ بیٹھے۔ دونوں پٹھوں نے لنگر لنگوٹے کسے اور "یا علی" کا نعرہ لگاتے ہوئے خم ٹھونکتے رانوں پر ہاتھ مارتے اکھاڑے میں اُتر آئے۔ اِدھر ٹنّاں نے انچھو سے کہا اُستاد اجازت ہے اُدھر گتی نے شہباز بیگ سے پوچھا اور ہاتھ ملا کر رگد بگد شروع کر دی۔ گتی ہاتھ پاؤں میں اکیس تھا تو ٹنّاں کی بندر بھبکیاں غضب کی تھیں۔ چھوٹی جوڑیں بڑی جوڑوں کی طرح نہ گاؤ زوریاں کرتی ہیں نہ پیچ کر لڑتی ہیں، اُنہیں تو جتنی جلد ہو سکے وار پار کی فکر ہوتی ہے۔ کچے پکے جتنے داؤں پیچ یاد ہوتے ہیں کوئی باقی نہیں رکھتے چنانچہ یہ کشتی بھی اسی قسم کی تھی۔ دونوں اپنے اپنے اُستاد کا نام روشن کرنا چاہتے تھے۔ پور پور پر داؤں کرنے لگے۔ ادھر سے ایک دستی ہوئی اُدھر سے دو دستی یا ایک آنٹی مارتا تو دوسرا الکھیڑ میں بیٹھ جاتا۔ کسی نے قینچی باندھی تو کسی نے بُقچی۔ ایک طرف سے

جھکوڑا تو دوسری طرف سے ٹال۔ غرض کوئی آدھ گھنٹے میں بیسیوں جوڑ توڑ ہو گئے۔ آخر ایک دفعہ ہی ٹنّاں کی جو آنکھ جھپکی تو بغل میں گھس گئی لے بیٹھا۔ ٹنّاں نے قلعہ جنگ پر اُڑانا چاہا۔ گتّی نے قینچی ڈال دی اور سانڈی چڑھانے لگا۔

سانڈی میں شانہ اُتر جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ لوگ ہاں ہاں کرنے لگے۔ اتنے میں کہیں ٹنّاں کے منہ میں گتّی کی انگلیاں آگئیں اور نواب صاحب کے منع کرتے کرتے اُس نے چبا ڈالیں۔ نواب صاحب آئیں تو جائیں کہاں۔ غصّہ کے مارے لال ہو کر اُٹھ کھڑے ہوئے، ہاتھ میں بید بھی ٹنّاں کو سونت ڈالا۔ اکھاڑے میں ادھم مچ گئی۔ وہ تو حکیم صاحب نواب صاحب سے رخصت ہوئے بغیر کھسک گئے اور چلتے چلتے آنکھوں سے اشارہ کر دیا کہ وید مچانے کی ضرورت نہیں، اپنے اکھاڑے والوں کو لے کر خاموشی کے ساتھ چلے آؤ ورنہ خدا جانے اُس روز کتنے سر پھوٹتے یا کیا ہوتا۔

اب ٹنّاں پہلوان کی سُنو وہ جو بھرے اکھاڑے میں نواب صاحب کے ہاتھوں پٹا تو ایسا منہ چھپایا کہ پہلے کئی مہینے تک گھر سے نہ نکلا پھر جو نکلا بھی تو لنگر کھول کر۔ اس کے بعد کشتی لڑنا تو ایک طرف عمر بھر کسی اکھاڑے کا رُخ نہیں کیا۔ نتھولی مل اور بڑے بھائی نے ہر چند سمجھایا، اپنے ساتھ دنگل کے انتظام میں لگانا چاہا۔ اس نے حامی نہیں بھری، بلکہ پہلوانوں کی صحبت میں بیٹھنا چھوڑ دیا۔ کامدانی کا کام بھی نہیں کیا اور تھوڑے دن کے بعد جب اس واقعہ کے چرچے کم ہو گئے تو کھیر بیچنے لگا۔ کوئی پرانا یار دوست مذاق مذاق میں پہلوان کہہ کر ذکر چھیڑ دیتا تو ایسا معلوم ہوتا جیسے زخم پر مرچیں چھڑک دیں۔ تیوری چڑھا کر کہتا "میاں کھیر بھی بیچنے دو گے یا نہیں۔ کیوں جی جلاتے ہو۔ رات گئی بات گئی۔ اب کے پہلوان کہا تو مجھ سے بُرا کوئی نہ ہو گا۔ اللہ میاں نے پہلوانی سے ہمارا منہ کالا کر کے کھیر والا بننا لکھا تھا"

بادشاہی لوگوں کی کھڑ حپن بھی ایسی ہوتی تھی۔ کہنے کو یہ لوگ بازاری شہدے کہلاتے تھے مگر ان میں بھی وہ آن بان تھی کہ آج ڈھونڈے نہیں ملتی۔ اب نہ وہ لوگ رہے نہ وہ باتیں۔ دلی کا پانی سڑ گیا۔ جمنا میں جب سے گندے نالے ملا دیئے گئے ہیں ہر چیز بد مزہ بے ذائقہ اور گندی پیدا ہوتی ہے پھر اُس کا اثر کیوں نہ ہو۔

ؤ

پنکھے والے حافظ جی

آج سے کوئی پچاس برس ہوئے دہلی میں ایک بزرگ جاڑے گرمی پنکھا ہاتھ میں لیئے پھرا کرتے تھے۔ قاضی کے حوض سے سرکی والوں، لال کنوئیں تک بازار میں اور پنڈت کے کوچے، بیناریوں، شاہ گنج اور شاہ تارا کی گلی کے اندر اندر انہیں چکر لگاتے دیکھا۔ یوں سُننے کو ہزاروں باتیں سُنیں۔ ایک ہی دن میں کسی نے کہا ہم نے قطب کی لاٹھ کے نیچے دیکھا ہے تو کسی نے بیان کیا کہ ہم ابھی روشن چراغ دہلی میں چھوڑ کر آئے ہیں بلکہ اجمیر سے آنے والوں نے اجمیر میں اور کلکتے سے آنے والوں نے کلکتے میں بھی دیکھا۔ مگر ہم نے تو سارے دن دوپہر شام انہی گلیوں اور انہی بازاروں میں پنکھا ہلاتے اور پھرتے دیکھا۔

لوگ انہیں مجذوب کہتے تھے ہوں گے۔ اللہ ہی جانے مگر ہم نے تو کبھی ان کی ایسی حالت نہیں دیکھی جیسی عام طور پر مجذوبوں کی ہوتی ہے۔ ہمیشہ کپڑے پہنے ہوئے۔ لٹھے کا انگرکھا، بغیر کرتے کے جس میں سے چھاتی کے بال نظر آتے۔ ایک برکا پاجامہ۔ اُجلا بے داغ۔ پاؤں میں گول پنجے کی جوتی۔ البتہ سر سے ننگے۔ ٹوپی پہنے کبھی نہیں دیکھا ہمارا لڑکپن تھا اور ان کا بڑھاپا۔ اس وقت وہ کم از کم ستّر برس کے پیٹے میں ہوں گے ہاڑ کے معمولی تھے۔ دُبلے پتلے۔ بال کھچڑی چاول زیادہ اور دال کم۔ رنگ گندمی تھا۔ کسی قدر میلا۔ صورت نورانی۔ چھوٹی سی ڈاڑھی۔ لبیں کتری ہوئیں۔ چہرے کی متانت۔

نہ بڑبڑانا نہ کسی سے کچھ بات کرنا۔ کوئی سلام کرتا تو پنکھا ہلا دیتے اور گزر جاتے۔ نہ لڑکوں کا غول ان کے پیچھے رہتا اور نہ کوئی ان سے بات چیت کرتا۔

دیوانہ کو دیوانہ بنا دینے کے بھی اسباب ہُوا کرتے ہیں۔ ممکن ہے کہ مجذوب پرست انہیں بھی چھیڑ چھیڑ کر پاگل بنا دیتے اور یہ بھی پتھر مارتے اور گالیاں بکنے لگتے۔ لیکن چونکہ ان کے بھتیجے محمد نذیر تھانیدار تھے۔ اپنے وقت کے مشہور تھانیدار اور اسی علاقے میں قاضی کے حوض کے تھانے پر ان کی تعیناتی تھی اس لیے کس کی ماں نے دھونسا کھایا تھا جو انہیں ستاتا یا ان کے ساتھ گستاخی سے پیش آتا۔

ہم نے محمد نذیر تھانے دار کو بھی دیکھا ہے۔ اگرچہ ہمارے ہوش میں انہوں نے پنشن لے لی تھی لیکن رُعب داب ان کا بدستور تھا۔ سرکی والوں کے بازار میں لال دروازے کے سامنے ایک کوچہ ہے جس کو نوراللہ بیگ کا کوچہ کہتے ہیں۔ اس کوچہ میں ان کا مکان تھا۔ شام کے وقت جاڑے گرمی کوچہ کے آگے پٹڑی پر کئی مونڈھے بچھ جاتے۔ ایک مونڈھے پر تھانے دار صاحب بیٹھے ہوئے دکھائی دیتے اور دوسرے پر مرزا وزیر بیگ بڑے ہاڑ کے آدمی تھے۔ شیر کا سا چوڑا چکلا چہرہ۔ مہندی سے رنگی ہوئی گول ڈاڑھی کے ساتھ آواز ایسی جیسے بادل گرجا۔ محمد نذیر بھی مہندی لگاتے تھے مگر مرزا کے مُقابلے میں اُن کا جُثّہ بہت حقیر تھا اس لیے یاروں نے اُن پر پھبتی اُڑائی تھی کہ لال مُرغوں میں ایک اصیل ایک ٹینی۔ بہرحال ان دونوں کا گٹھ جوڑ تھا جب تک یہ دونوں زندہ رہے کوچے کے آگے کی بیٹھک نہیں چھوٹی اور کبھی دونوں میں سے ایک کو اکیلا نہیں دیکھا۔ تھانے دار صاحب کے چچا جس وقت اپنے گشت میں اُدھر سے گزرتے تو دو چار منٹ کے لیے ایک مونڈھے پر ہو بیٹھتے اور خاموش بیٹھے رہتے۔ اتنی دیر تک یہ دونوں بھی کوئی بات نہ

کرتے۔ نیچی نگاہیں کیے مؤدب انہیں دیکھا کرتے۔

محلّے اور بازار کے شیر جب ان کے آگے گردنیں جھکا لیتے تو لومڑیاں کیا ان کے گرد ہوتیں۔ دوسرے ان کی صورت ایسی تھی کہ لوگ ہنستے، نہ کوئی حرکت ایسی کہ لڑکے بالے چھیڑیں۔ اب رہے درویشوں کے پرستار یا مجذوبوں کے متوالے وہ اکیلے دُکیلے ضرور ان سے عرض معروض کرتے ہوں گے۔ ہم نے اس کے متعلق کچھ سُنا نہیں۔ درحقیقت درویشوں کی شہرت ان کی شوریدہ مزاجی ہی سے ہوتی ہے۔ یہ خاموش تھے اس لیے علانیہ نہ ان کا پہنچے ہوئے فقیروں میں شمار تھا نہ مجذوبوں میں۔

ہم نے ان کا نام معلوم کرنا چاہا۔ افسوس جس سے پوچھا اس نے لاعلمی ظاہر کی اور یہی کہا کہ محمد نذیر تھانے دار کے چچا ہیں۔ پھر ہم نے بعض اپنے بڑوں سے پوچھا کہ ان کی یہ کیفیت کب سے ہے؟ اس کا جواب نفی میں ملا۔ یہی کہ ہم نے جب سے دیکھا اسی حالت میں دیکھا۔ لڑکپن کی ایک خصلت یہ بھی ہے کہ جس بات کا پتہ نہیں لگتا اس کی کرید ہو جاتی ہے۔ ایک دن میں اپنے مکان کی ڈیوڑھی پر نانا کے ساتھ کھڑا تھا کہ سامنے سے حضرت پنکھا ہلاتے گزرے۔ میں نے نانا سے بھی ان کے متعلق سوالات شروع کر دیے۔ اتنے میں کریم اللہ خاں آ گئے۔ یہ شیدی گوہر کے پوتے تھے۔ محلّے میں سب سے بڑی عمر کے آدمی۔ ہمارے مکان کے سامنے ان کا گھر تھا۔ پوچھنے لگے "کیوں بھئی نانا سے کیا باتیں ہو رہی ہیں؟"

نانا نے کہا "محمد نذیر کے چچا کو پوچھتا ہے کہ کب یہ دیوانے ہوئے" کہنے لگے آؤ بیٹا ہم بتائیں۔ ہم نے ان کا بچپن بھی دیکھا ہے بلکہ مسجد میں ہم دونوں کئی مہینے تک ساتھ پڑھے ہیں۔ یہ بڑے شریر تھے۔ ملّا جی ان کی خوب ٹھکائی کیا کرتے۔ مگر ذہن ایسا اچھا

تھا کہ چھ مہینے میں قرآن حفظ کر لیا"۔

اس دن معلوم ہوا کہ واقعی حافظ ہیں لوگ یونہی نہیں کہتے۔ میں نے پوچھا کہ اچھا پھر ان کا دل کس طرح اُٹھا؟

انہوں نے بتایا کہ یہ سامنے جو سیّد کا تھان ہے۔ جمعرات کی جمعرات، اب تو اتنے نہیں پہلے بہت چڑھاوا چڑھا کرتا تھا۔ بیسیوں چراغ جلتے۔ کبھی کبھی کوئی قوّال یا مُناجاتی آبیٹھتا۔ یہاں میں چاہتا ہوں کہ سیّد کے تھان کی جگہ بھی آپ کو بتا دوں۔ جہاں اب پیرجی عبدالصمد مرحوم کا مکان ہے یہاں کچھ کچّے مکان اور کچھ کچّے کھنڈر تھے اسی النگ میں شاہ گنج کی طرف چلو تو کچّے ڈھابوں کے برابر سفید گھوڑے والے میر صاحب کا اصطبل تھا۔ اصطبل کے آگے میدان۔ لڑکے کبڈّی، گلّی ڈنڈا۔ گیند چڈّی اور گیڑیاں کھیلا کرتے تھے۔ میدان کے خاتمے پر کسی پرانی عمارت کی ایک محراب سی باقی تھی اور اس میں ایک طاق بنا ہوا تھا۔ اسی طاق پر کسی سیّد صاحب کا گزر سمجھنا چاہئے وہیں سہرے لٹکائے جاتے۔ کھیلیں بتاشے ریوڑیاں وغیرہ چڑھائی جاتیں۔ گھی کے چراغ جلتے۔ جمعرات کو یہ بہار ہم نے بھی دیکھی ہے۔ جھاڑو ملتی، چھڑکاؤ ہوتا اور شام سے رات گئے تک بیسیوں عورتیں اور مرد چڑھاوا چڑھانے آتے۔ نوچندی جمعرات کو ڈھولک بھی بجتی۔ کسی کسی کے سر پر کبھی کبھی سیّد صاحب بھی آجاتے۔ ہمیں ممانعت تھی کہ جمعرات کو اُدھر ہرگز نہ جانا۔ ہم بھی کچھ ڈرے گئے اور اس لیے کہ گھر والوں میں سے کسی نے دیکھ لیا تو خفا ہوں گے اس طرف نہ جاتے۔ دور ہی د[illegible]سے تماشا دیکھا اور گانا سنا کرتے۔

اچھا تو کریم اللہ خاں نے سنایا "مشہور تھا کہ تھان والے سیّد کوئی بڑے جلالی

ہیں۔ جب بگڑ جاتے ہیں تو بچے بوڑھے عورت مرد کسی کو نہیں دیکھتے۔ کئی قصے بھی کہے جاتے تھے کہ جمعرات کو طاق میں فلاں شخص کو اس صورت میں نظر آئے تو فلاں کو اس روپ میں۔ کیا مقدور ان کے نام کے چڑھاوے کو کوئی ہاتھ تو لگا لے۔ نخو کی پہلوان نے منع کرتے کرتے جلیبیوں کا دونا اٹھا لیا تھا ایسا پٹخنا دیا کہ خون تھوکتے تھوکتے آخر مر گیا دھنو دھنو ایک نٹنی تھی بڑی شہدن خلیفہ کلن نے اس کو ڈال لیا تھا۔ کسی نے کھیر کا پیالہ چڑھایا۔ اس کی رال ٹپک پڑی۔ ہاتھ ڈالتے ہی لوٹن کبوتر بن گئی۔ غرض یہ ہے کہ ایسی ایسی کہانیاں سنا کر بچوں کو وہاں جانے سے روکتے تھے۔ لیکن بچے کیا مانتے۔ ریوڑیوں اور میٹھی کھیلوں کے لالچ میں آس پاس لگے ہی رہتے۔ کیونکہ بعض لوگ چڑھاوا چڑھانے کے بعد تھوڑی مٹھائی بچا کر بچوں کو بھی بانٹ دیتے۔ ملا جی نے ہم کو منع کر رکھا تھا اور چونکہ مسجد سامنے ہی تھی ان کے ڈر سے کوئی لڑکا نہ جاتا۔ جاتا بھی تو آنکھ بچا کر۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ملا جی دعوت میں گئے ہوئے تھے۔ نوچندی جمعرات تھی۔ ہم کو موقع ملا، جا پہنچے۔ یہ حافظ جی بھی آ گئے ایک عورت نے برفیوں کا دونا چڑھایا۔ حافظ جی کے منہ میں پانی بھر آیا کہنے لگے یار اس پر ہاتھ مارنا چاہئے۔ میں نے کہا اگر تم نے یہ دونا اچک لیا تو صبح کو اتنی ہی برفیاں اور کھلاؤں گا بولے اچھا ٹھہرو۔ ذرا سوفتہ ہو جانے دو۔

چنانچہ ہم پرے ہٹ کر کھڑے ہو گئے اور سوفتہ ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ عشاء کی نماز کے بعد بھیڑ چھٹنی شروع ہوئی اور نو بجتے بجتے آنے جانے والوں کا تانتا ٹوٹ گیا۔ ان دنوں آج کل جیسا حال تو تھا نہیں کہ آدھی آدھی رات تک گلی کوچے چلتے رہیں۔ عشا کی نماز کے بعد گلی میں کون چلتا پھرتا۔ تھان کے چراغ بھی ٹمٹمانے شروع ہو گئے۔ حافظ جی ادھر ادھر دیکھتے ہوئے آگے بڑھے اور جاتے ہی طاق پہ جھپٹا مارا۔ برفیوں

کے دونے پر ہاتھ پڑنا تھا کہ طاق کے اندر سے ایک پنجہ نکلتا ہوا دکھائی دیا۔ حافظ جی "خیر خیر" کہتے ہوئے طاق کی حد کے باہر آکر گر پڑے اور ہم بھاگ کر اپنے گھروں میں گھس گئے رات بھر مجھے بخار چڑھا رہا۔ حافظ جی پر کیا گزری۔ کچھ خبر نہیں۔

صبح کو جب میرا بخار اُترا اور مجھے ہوش آیا تو گھر میں چرچا سُنا کہ حافظ جی کا بُرا حال ہے۔ ملیدے کے دینے پڑے ہوئے ہیں۔ لڑکے مانتے ہی نہیں۔ لاکھ دفعہ منع کیا کہ سید صاحب کے تھان پہ بچوں کا کام نہیں۔ اب مزہ آیا اور جائیں۔ معلوم ہوا کہ جب مولا بخش بڑھئی صبح کی نماز پڑھنے جا رہا تھا تو اس نے حافظ جی کو بیہوش پڑے ہوئے دیکھا۔ بڑی مشکل سے اُٹھا کر مسجد میں لے گیا۔ نماز کے بعد ملاجی نے بہتیرا پڑھ پڑھ کر پھونکا مگر حافظ جی کو ہوش نہ آیا۔ آخر ان کے گھر والوں کو خبر کی۔ بیچارے رات بھر پہلے ہی پریشان رہے تھے۔ سنتے ہی بے اوسان ہو کر بھاگتے ہوئے آئے اور ڈولی ڈنڈا کر کے اُٹھا لے گئے۔

اس زمانے میں کبھی کبھی گھڑ چڑھے فقیر آیا کرتے تھے۔ اس اثنا میں وہ بھی آگئے گھڑ چڑھے فقیروں کی صدا جو حافظ جی کے گھر والوں کو پہنچی تو حافظ جی کو پکڑ کر ان کے سامنے لائے۔ انہوں نے دیکھتے ہی کہا: "مائی یہ تو میراں کی جھپٹ میں آگیا ہے۔ پیران کلیر والے کے ہاں لے جاؤ نہیں تو پاگل ہو جائے گا۔"

حافظ جی کے گھر والوں میں کوئی مرد نہیں۔ دُکھڑا پیٹنے والی عورتیں ہی عورتیں تھیں۔ ماں بیچاری سے جس طرح بنا ممتا کی ماری پیران کلیر لے گئی۔ طبیعت میں ایک قسم کی وحشت جو چلی آتی تھی وہ تو جاتی رہی لیکن آدمی کی جون میں نہ آئے۔ پھر ایک مرتبہ سُنا کہ مدار کی چھڑیوں والوں کے ساتھ اجمیر شریف کی طرف نکل گئے۔ لوگ ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر

بیٹھ رہے۔ عورتوں نے بھی ان کو صبر کر لیا۔ کوئی گیارہ برس کے بعد خود بخود آ گئے لیکن آنا نہ آنا یکساں تھا۔ نہ گھر کے کام کے تھے نہ باہر کے۔ چپ یہاں کھڑے ہیں وہاں بیٹھے ہیں۔ کھانا کھلا دیا کھا لیا۔ پانی پلا دیا پی لیا۔ ورنہ کچھ نہیں۔ کپڑے میلے ہیں بلا سے پھٹ گئے تو پھٹ جائیں۔ نہ نہانا نہ دھونا نہ نائی نہ دھوبی۔

اتنے میں محمد نذیر سپاہیوں میں نوکر ہو گئے تھے ان کے آتے ہی یکایک حوالدار ہو گئے ان کی کرامت سمجھی گئی۔ انہوں نے ان کا خیال رکھنا شروع کیا۔ جمعہ کے جمعہ ان کا خط بنواتے نہلواتے کپڑے پہناتے۔ چنانچہ اس وقت سے ان کی یہی کیفیت ہے دیوانے تو البتہ نہیں ہیں لیکن دن رات پنکھا ہلاتے پھرنے سے کام ہے۔ اللہ ہی جانے کس خیال میں مست رہتے ہیں اور مجذوبوں یا فقیروں میں ان کا کیا درجہ ہے۔ ہم تو بھئی ایسی باتوں کے قائل نہیں"

کریم اللہ خاں کی زبان سے یہ سن کر ہم تو ان باتوں کے قائل نہیں مجھ کو بڑا تعجب ہوا اس لیے کہ اس زمانے میں ظاہری حکومت کے ساتھ باطنی حکومت کی بڑی دھوم تھی۔ ہر انوکھا فقیر اور مجذوب خدائی فوجدار سمجھا جاتا تھا۔ علاقے بٹے ہوئے تھے۔ فلاں صاحب دلی دروازے سے جامع مسجد تک کے قطب ہیں تو فلاں بزرگ کی عملداری کشمیری دروازے سے لاہوری دروازے تک ہے۔ حافظ جی کو بھی بعض لوگ اپنے علاقے کا حاکم سمجھتے۔

مختصر یہ کہ حافظ جی کے متعلق کوئی خاص کرامت تو منسوب نہ تھی تاہم ان کی قطبیت میں بھی شبہ تھا۔ مجھے ان سے ایک قسم کی دلچسپی ہو گئی تھی۔ اکثر ان کے ساتھ ساتھ دور تک چلا جاتا۔ شوق تھا کہ کبھی ان کی آواز سنوں۔ مہینوں گزر گئے۔ کبھی کبھی ہونٹ ہلتے ہوئے تو ضرور دیکھا لیکن آواز سننے میں نہیں آئی۔

ایک روز ٹھیک دوپہر کا وقت تھا اور جیٹھ گرمی کا موسم۔ خدا معلوم کیوں میں ڈیوڑھی

کے باہر آیا۔ گلی بالکل سنسان تھی۔ دیکھتا کیا ہوں کہ حافظ جی غیر معمولی تیز قدمی کے ساتھ جا رہے ہیں۔ پنکھا بھی زور زور سے ہل رہا ہے۔ تیور بدلے ہوئے۔ آپ ہی آپ کچھ بول بھی رہے تھے۔ میں پیچھے پیچھے ہو لیا کہ سنوں کیا کہتے ہیں۔ چند قدم کے بعد صاف آواز آنے لگی۔ ایسی جیسے کوئی وعظ کہتا ہے۔ ان کے الفاظ تو کیا یاد رہتے یہ بھی ان کی کرامت سمجھو کہ مفہوم آج تک مجھ کو یاد ہے۔ اس وقت تو میں کچھ سمجھا نہیں لیکن آج جب ان کی بڑ کا خیال آتا ہے تو ان کے صاحبِ نسبت ہونے میں شک نہیں رہتا۔ واقعی خاموش اللہ والے تھے۔ ان کی بڑ کا مفہوم میں اپنے لفظوں میں آپ کو سناتا ہوں۔ سمجھ لیجیے اللہ والوں میں ان کا کیا درجہ ہوگا۔

"دُور ہو دُور، او دنیائے دلفریب دُور۔ دُور! تو نے مکّار دھوکے باز مجھے کن مصیبتوں میں پھنسا دیا ہے۔ میں مختار نہیں بندۂ مجبور ہوں۔ اپنی خوشی ایک ایک لمحہ یہاں قیام نہیں کر سکتا۔ کیا مقدور اپنے ارادے سے سانس تک لے سکوں۔ میں آزاد نہیں پابند ہوں۔ اپنی مرضی سے کچھ نہیں کر سکتا۔ ہر وقت چشم براہ اور ہر لحظہ گوش بر آواز ہوں۔ آقا کے حکم کا انتظار ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ کس وقت میری طلبی کا فرمان آ جائے۔ آہ اس فرمان کے بعد اس کے سوا چارۂ کار نہیں کہ جس طرح بیٹھا ہوں اسی طرح اُٹھ کھڑا ہوں۔ پھر تو ہی انصاف کر کہ یہ آخری لمحہ میرے لیے کس قدر دشوار ہو جائے گا۔ اگر میں ابھی سے ان کانٹوں کو نہ ہٹا لوں جو خواہشوں نے بچھا رکھے ہیں اور ان پتھروں کو دُور نہ کروں جن کی موجودگی میں قدم جنبش نہیں کر سکتے۔ لوگ مجھے دیوانہ کہتے ہیں۔ دیوانہ ہی سہی۔ کسی نے میرا نام مجذوب رکھا ہے۔ قربان اگر میاں

اپنے اندر مجھے جذب کرلیں۔ دنیا مجھ کو گونگا بہرا اپنے حال سے بے خبر سمجھتی ہے۔ لیکن نہ میں گونگا ہوں نہ بہرا نہ اپنے حال سے بے خبر۔ جو اپنے آقا کی آنکھیں دیکھ چکا ہو۔ جس نے اپنے مالک کی پکاریں سُنی ہوں کون ہے جو اسے بے خبر کہے۔

دُور ہو دُور! مجھے اپنی آرائشوں سے معاف کر۔ میں ان کو کیا سنواروں جن کا رنگ چند روز میں تبدیل ہو جاتا ہے اور جو سودائے اعتدال میں ذرا کمی ہونے سے موت کا پیام دینے لگتے ہیں۔ آہ! میں اس چہرے کو کیا آئینے میں دیکھوں جس کی بناوٹ نہ جانے کون سی ادا پیا کو بھاتی ہے۔ جس کی تر و تازگی چند روز کی مہمان ہے اور جو تھوڑے دن میں ڈراؤنی شکل اختیار کرنے والا ہے بتا میرا منہ کیا دیکھتی ہے بتا آخر میں کس اُمید پر اس پیکرِ فانی کو لباسِ فاخرہ سے آراستہ کروں جس کے انتظار میں قبر کے پُر شور ذرات بے چین ہو رہے ہیں تو جیسا ماں کے پیٹ سے نکلا تھا۔ ویسا ہی پھرتا۔ تجھ کو اور تیری ذریات کو دعوت دیتا کہ آ اور مجھ سے شرما یا مجھ کو شرما۔ لیکن کیا کروں میرے مالک کا حکم نہیں۔

اری چڑیل، چھل پائی! تو مجھے طعنے دیتی ہے۔ اضطراب کے طعنے آخر میں ان در و دیوار کے اندر کیوں کر چین سے بیٹھوں جن سے عنقریب جبری طور پر یا بدستِ دگرے دست بدستِ دگرے مجھ کو جُدا کیا جائے گا، اور میں تیرے اس ساز و سامان سے کس طرح دل خوش کروں جبکہ تھوڑے ہی عرصے میں یہ میرے قبضے سے باہر ہونے والا ہے تیرے میکدے کے

متوالوں کی رنگین صحبتیں مجھے بھی غفلت کی ترغیب دے چکی ہیں لیکن میں ان تماشوں سے کیوں آنکھیں بند کر لیتا جو میرے سامنے ہو رہے ہیں میں کس طرح واقعات کو دل سے بھلا دوں۔ جانتا ہوں کہ یہ صحبتیں عنقریب برہم ہو کر رہیں گی اور وہ زمانہ کچھ دُور نہیں کہ محبت و یکجائی کا شیرازہ ٹوٹ جائے گا تو ہنسے گی اور سب روئیں گے۔

غرض میں نے جدھر نظر اُٹھائی اور اب بھی جس طرف نظر اُٹھاتا ہوں تیری ہر شے میں مکار بیسوا کی دلفریبی پائی اور آج بھی پاتا ہوں لیکن ایک ایسی دل فریبی جس کے اندر زوال کا اضطراب اور فنا کی افسردگی موجیں مارتی دکھائی دیتی ہے اور اس لیے مجھ کو چین نہیں مجھے تو خوشی کی جگہ ملال امن و عیش کی جگہ بیقراری و تکلیف کا سامنا رہتا ہے۔ خاموشی کے سوا کوئی چارہ نہیں، اندر ہی اندر گھٹ کر دل ہی دل میں حافظ کا یہ شعر پڑھنے لگتا ہوں ؎

مرا در منزلِ جاناں چہ امن و عیش چوں ہر دم
جرس فریاد می دارد کہ بربندید محمل ہا

اب میں حافظ کو کیا کہوں۔ تجھ کو جس میں فریب کے سوا کچھ نہیں منزلِ جاناں بتاتے ہیں منزلِ جاناں اگر یہی ہے تو ایسی منزلِ جاناں کو سلام لیکن نہیں منزلِ جاناں کو اس سے زیادہ دغا بازی کا گھر ہونا چاہیے۔ عشق و ہوس کا امتحان آخر کس طرح ہوتا۔ کیوں! پتہ کی سُن کر گھبرائی۔ حافظ جیسے خوش مذاق لوگوں نے تجھ کو منزلِ جاناں کہہ دیا تو اکڑ گئی۔ لگی ہم کو بھی اپنا ٹھٹی پن

دکھانے۔ اپنی آرائش و دلکشی کے لحاظ سے تو منزلِ جاناں سہی۔ ہم بھی حافظ کی لے میں لے ملاکر کہتے ہیں کہ تو منزلِ جاناں، منزلِ جاناں، لیکن منزلِ جاناں کہنے کے بعد یہ بھی دیکھا کہ حافظ جی نے آنکھیں کس طرح نیچی کرلیں، سر کیسا جھکا لیا۔ انہیں فوراً یاد آگیا کہ ایک بے قرار راہرو کو اس منزل میں امن وسکون اور راحت و آسودگی کے کیا معنی جہاں ہر لحظہ فریاد جرس بلند ہو رہی ہے کہ اُٹھو اسباب سنبھالو۔ کمر باندھو۔ سفر کی تیاری کرو۔ یہ جرس کیا ہے؟ نفس کی آمد و شد جو ہر دم عمر کی کمی اور موت کے قرب کا پتہ دے رہی ہے ؎

اے غافلو! دم اِترہ نمط آئے جائے ہے
سوچو کہ نخلِ عمر کو یہ کھائے جائے ہے

پھر؟ پھر کیا ایک "عابرِ سبیل اور ایک عامل کُنْ فِی الدُّنیا غریبًا" کو راستے کی رُوح افزائیوں اور دلکشائیوں سے کیا لطف حاصل ہو سکتا ہے جب تک وہ اپنے اصلی وطن کی سرزمین پہ قدم نہ رکھے جہاں پھول مرجھانا نہیں جانتے اور جہاں خزاں کا نام کسی کو معلوم نہیں۔ نہ رُتیں بدلتی ہیں نہ اندھیرے اُجالے سے واسطہ رہتا ہے"۔

اتنا کہنے کے بعد حافظ جی نے یکایک پلٹ کر دیکھا اور پنکھا زور زور سے ہلانے لگے۔ اس وقت ان کے چہرے پہ ایک عجیب جلال تھا۔ میں ڈر کر بھاگا اور گھر میں آکر دم لیا۔ اس کے بعد کوئی ایک ہفتے تک وہ بالکل نظر نہ آئے۔ پوچھنے پر

معلوم ہوا کہ پردہ کر گئے۔ ایک دن خلافِ معمول شام کے وقت گھر میں گئے۔ وضو کیا نماز پڑھنے کھڑے ہوئے۔ اللہ اکبر کہتے ہی سجدے میں گر پڑے۔ عورتیں دیکھنے کو دوڑیں تو ختم تھے۔ سدا رہے نام اللہ کا۔

مرزا سکندر بخت

کیا شاندار نام ہے گویا ابھی تاج و تخت بلا گرداں اور پابوس ہو رہے ہیں۔ نام کے ساتھ صورت بھی شاہانہ تھی۔ لمبا قد، موزوں ڈیل ڈول۔ آنکھ ناک نہایت دیدارو۔ رنگ البتہ ذرا سانولا تھا۔ لباس بھی اپنا خاندانی پہنتے تھے۔ بہادر شاہ کی تصویر دیکھی ہو گی بالکل وہی وضع سمجھو۔ وہ ان کی چوگوشیہ اونچی باڑھ کے نیچے سے دبی اور آگے سے تاج کی طرح اٹھی ہوئی ٹوپی۔ وہ تن زیبی چوڑی سنجاف کا انگرکھا۔ اس پر جامہ وار کی سینہ کھلی نیمہ آستین۔ تنگ موری کا پاجامہ۔ سموسہ کیا ہوا چکن یا شال کا رومال کندھوں پر پڑا۔ پانوں کی ڈبیا اور چھالیہ کا بٹوا ہاتھ میں دیکھنے والا کون بھول سکتا ہے۔

لیکن وہی مثل تھی کہ خوان بڑا خوان پوش بڑا کھول کے دیکھو تو آدھا ہی بڑا۔ کبھی لال قلعہ میں رہتے ہوں گے۔ بادشاہ زادوں میں شمار ہو گا۔ اب تو مدت سے کلاں محل کے قریب ایک چھوٹا سا مکان کرائے پر لے رکھا تھا۔ شاہزادگی بھی خلاصہ ہوتے ہوتے ساڑھے پانچ روپے ماہوار کی رہ گئی تھی۔ ساڑھے پانچ روپے اور تیس دن گزارا کرنا۔ دھوبی۔ سقہ حلال خوری تیل بتی۔ کھانا پینا پھر پان زردے کا بھی جھگڑا۔ ہر وقت اُجلا رہنا، ہر چیز صاف ستھری۔ گھر میں بھی صفائی۔ دری، چاندنی، قالین، گاؤ تکیہ، پٹاری، خاصدان، کورے کورے مٹکے، کوری کوری جھجریاں، کٹورے، آبخورے، برتن تمام کے تمام جھم جھم کرتے۔ آپ کو گمان ہوگا کہ پرانی دیگ کی کھرچن ان کے پاس ہو گی؟ ممکن ہے کہ مکان کسی نے یونہی دے رکھا ہو۔ اس

زمانے تک ایسی باتیں غیر معمولی نہ تھیں۔ ہم نے مانا کہ وہ مکان کے کرائے سے چھٹے ہوئے تھے پھر بھی ساڑھے پانچ روپے سونے کے تو نہ ہوں گے۔ یہی سولہ آنے کا روپیہ اور ایک آنے کے چار پیسے۔ یہ ٹھاٹھ آخر مرتے دم تک کیوں کر قایم رہے۔ جہاں تک تحقیق کیا کوئی دستِ غیب بھی نہ تھی۔ کبھی نہیں سنا کہ دوسرے اُجلے پوشوں کی طرح انہوں نے کسی کے سامنے اپنی تنگ دستی کا دُکھڑا رویا ہو۔ عام دعوتوں میں جانا تک تو ان کے لیے عار تھا۔ اس کے علاوہ وہ جیب دیکھا خوش۔ جہاں ملے اور پانوں کی ڈبیا کھلی۔ ہمیں یاد نہیں کہ کبھی ان کی تیوری پر بل دیکھے ہوں یا ان کی زبان سے کوئی شکایت کا لفظ سُنا ہو۔

میرے ایک کرم فرما نے میرا ان سے تعارف کرایا تھا۔ اس کے بعد وہ جب کہیں ملتے یا پرانی باتیں سُننے کو میرا جی چاہتا اور میں ان کے درِ دولت پر حاضر ہوتا اس قدر تپاک سے ملتے اور ایسی خاطریں کرتے۔ جیسے کوئی برابر والا ہوتا ہے۔ حالانکہ عمر کے لحاظ سے وہ غالباً میرے والد سے بھی دو چار سال بڑے ہی تھے۔ اس لیے مجھ کو ان کی زندگی کے حالات میں تفحص کرنے کا کچھ زیادہ موقع ملا اور اب میں بلا خوفِ تردید کہہ سکتا ہوں کہ انہیں ساڑھے پانچ روپے کے علاوہ کہیں سے کوئی آمدن نہ تھی۔ وہی قلیل رقم ان کا اوڑھنا تھا اور وہی بچھونا۔ اسی میں ایسے مگن تھے جیسے بادشاہ اپنے تخت پر۔ درحقیقت استغنا نے ان کو پُورا اطمینانِ قلب دے رکھا تھا۔ اطمینانِ قلب ہی ایک ایسا سرمایہ ہے جس کے مقابلے میں دنیا کی تمام دولتیں ہیچ ہیں۔ اصلی راحت اگر انسان کو میسّر ہو سکتی ہے تو صرف قلب میں اطمینان پیدا کرنے سے۔ طبیعت کو ڈانوا ڈول نہ کیجئے۔ روپے کو زندگی نہ سمجھئے۔ اقبال کے زوال پر افسوس اور وقت بگڑ جانے کا غم آدمی کو ذلیل کرنے کے سوا کوئی فائدہ نہیں پہنچاتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہی ان کی تندرستی، خوش بسری اور خندہ روئی کا اصل راز تھا۔

مرزا صاحب خدا بخشے میرے ساتھ بہت بے تکلف ہو گئے تھے۔ بے تکلفی کا یہ مطلب یہ نہیں کہ انہوں نے کبھی مجھ سے کوئی سوال کیا ہو یا عام شہزادوں کی طرح اپنے ڈھکے کھلے حالات سنایا کرتے ہوں۔ حاشا وکلا۔ بلکہ دن ہو یا رات کسی وقت بھی میں ان کے پاس چلا جاتا اور وہ کسی حال میں کیوں نہ ہوتے مجھے بلا لیتے اور جب تک جی چاہتا میں بیٹھا رہتا ذرا نہ اُکتاتے۔ اس سبب سے میں ان کی ظاہری شان کے علاوہ خانگی زندگی سے واقف ہو گیا تھا۔ اپنی تنگی ترشی کو وہ جس طرح ہنس ہنس کر ٹالتے تھے خدا ہر آبرو دار سفید پوش کم اوقات شریف مسلمان کو ایسی ہی توفیق دے۔

دوپہر کا وقت تھا کوئی بارہ بجے ہوں گے۔ مرزا صاحب کے گھر سے جو گزرنا ہوا جی میں آیا کھڑے کھڑے ہوتے چلو۔ وہ بھی اتفاق سے اسی وقت آئے تھے۔ آواز دی تو بولے آجاؤ میاں میں بھی ایک میت کے ساتھ چلا گیا تھا۔ ابھی آیا ہوں۔ کپڑے بھی نہیں اتارے

میں: تو پھر آرام کیجیے۔

مرزا صاحب: واہ یہ بھی کوئی بات ہے۔ کیا آگ لینے آئے تھے جو آئے اور چلے آؤ آؤ کواڑ کھلے ہوئے ہیں۔

میں (اندر جا کر) آپ نے تو ابھی کھانا بھی نہیں کھایا ہوگا؟

مرزا صاحب: صبح کو دال موٹھ بنائی تھی۔ اس کا ناشتہ کر ہی رہا تھا کہ ایک ملنے والے کے مرنے کی خبر آگئی۔ اُٹھ کر سیدھا وہاں چلا گیا۔ بس اب وہیں سے چلا آتا ہوں (ہنس کر) کندھے دُکھ گئے۔

میں: آپ ہیں بڑے زندہ دل۔ ایک دوست مرا اسے کندھا دیا اور اب ہنستے ہیں

مرزا صاحب: ہنسوؤں نہیں تو روؤں۔ جب یہ عارضی گھر ہنستے ہی بستا ہے تو اس

ہمیشہ کے گھر کو بسانے کے لیے نہ ہنسیں اور مجھے ہنسی یوں آئی کہ ان کے تو بہت سے ملنے والے تھے پھر بھی کوئی کندھا دینے نہیں آیا۔ ہمارا تو کوئی نہیں دیکھیں ہوا کیوں کر اُڑا کرلے جاتی ہے۔

میں : آپ ہوا کے کندھوں پر جائیں گے ؟

مرزا صاحب : اور کیا ؟

میں : اچھا تو آج ناشتے میں آپ نے دال موٹھ اڑائی۔

مرزا صاحب : اور ایسی چٹپٹی بنی تھی کہ ضرورت سے زیادہ کھا گیا۔

میں : آپ کو دال موٹھ بنانی آتی ہے ؟

مرزا صاحب : مجھے کیا چیز نہیں آتی۔ تم کو شاید معلوم نہیں کہ غدر کے بعد سے میں نے بازار کا پکوان۔ بازار کی مٹھائی دہی بڑے وغیرہ سب کچھ چھوڑ دیا ہے۔ کیوں بھئی تمھیں ناپاک ہاتھوں کی بنی ہوئی چیزیں کھاتے کراہت نہیں آتی !

میں : ہے تو واقعی کراہت کی بات۔ آپ نے تو اس وقت مجھے بھی نفرت دلا دی۔

مرزا صاحب : مگر تمھاری نفرت یا کراہت قایم نہیں رہ سکتی۔ اس لیے کہ تم ان چیزوں کا بنانا جانو۔ نہ تمھیں اتنی فرصت کہ بیٹھ کر بناؤ۔ اور نہ تمھاری نیت بھری ہوئی ہے کہ نہیں کھاتے تو نہ سہی۔ یہاں خدا کے فضل سے ہاتھ کے کارندے بھی ہیں۔ وقت بھی ہے اور نیت بھی سیر۔ مدّتوں کے بعد کل شام کو دال سیو والے کی آواز آئی۔ ذرا دل بھر بھر آیا کہ صبح ہی دال موٹھ بنا ڈالی۔

میں : اور سیو نہیں بنائے ؟

مرزا صاحب: سیوں میں جھگڑا زیادہ کرنا پڑتا ہے۔ دال موٹھ میں تو چنے کی دال بھگوئی نمک مرچ کھٹائی لگائی اور تھوڑی دیر میں تیار

میں: بس دال موٹھ اسی طرح بناتے ہیں؟

مرزا صاحب: کم بخت بنی ایسے مزے کی تھی کہ ضرورت سے زیادہ کھا گیا۔

میں: کیا زیادہ بنا لی تھی؟

مرزا صاحب: مجھے ہر چیز کا ہوکا ہے۔ تھوڑی چیز نہ ہاتھ کو جچتی ہے نہ آنکھ کو۔ مگر یہ بھی کچھ اللہ میاں کی مصلحت ہی تھی۔ بھلا اس وقت آکر کیا پکاتا اور کیا کھاتا۔

میں: اس میں سے بچ بھی گئی تھی؟

مرزا صاحب: آدھی سے زیادہ ہے۔ اب دیکھو اس کو کھاتا ہوں۔ ذرا منہ ہاتھ دھو لوں۔ بھوک تو کچھ ایسی ہے نہیں۔ خیر تم بھی چکھنا۔

نہایت آہستہ آہستہ کپڑے اتارے۔ ٹوپی کو ایک ٹین کے ڈبے میں رکھا۔ انگرکھا کھونٹی پر ٹانگ اس پر ایک کپڑا ڈال دیا تاکہ گرد سے محفوظ رہے۔ نیمہ آستین تہہ کر کے صندوق میں بند کی۔ گرتہ پاجامہ بھی بدل ڈالا اس سے فرصت پا کر ہاتھ منہ دھویا۔ پھر توکرے کے نیچے سے ایک سفید چینی کا پیالہ نکالا جس پر سفید ململ کا ٹکڑا بندھا ہوا تھا۔ دسترخوان بچھایا اور پیالہ اس پر رکھ کر بولے۔ آؤ بھئی کھانا نہیں چکھو تو۔

میں نے دیکھا تو بھیگی ہوئی دال تھی جس پر نمک چھڑکا ہوا تھا۔

میں: قبلہ! آپ نوش فرمائیے۔ اللہ زیادہ دے۔

مرزا صاحب: اللہ نے تو خوب دے رکھا ہے۔ میرا منہ اس قابل کہاں۔ مگر تمہیں قسم ہے دو دانے منہ میں ڈال کر تو دیکھو۔

اُن کے اصرار سے چکھا تو واقعی عجیب مزہ تھا۔

مرزا صاحب، کیوں۔ کوئی چیز ہے۔ یہاں لوگ آب و نمک کو نہیں سمجھتے اور کھانے میں سارا مزہ اسی کا ہوتا ہے۔

مَیں، مگر دال تو کچّی ہے؟

مرزا صاحب: اور دال موٹھ کسے کہتے ہیں؟

مَیں: خوانچے والوں کے پاس تو خشک ہوتی ہے۔

مرزا صاحب، خشک کرنے کا مجھے موقع کب ملا۔ بہر حال مزے کو دیکھو۔

مَیں: مزے میں تو کلام نہیں۔

الغرض مرزا صاحب نے بڑے اطمینان کے ساتھ ایک پیسے میں ایک وقت گزارہ کر لیا۔ اسی طرح ایک روز جو میرا جانا ہوا تو اپنے کپڑے دھو رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی بولے۔ آج کل دھوبی اس قدر بے شعور، بے احتیاط، بدتمیز، اور بے درد ہو گئے ہیں کہ جو کپڑا دو دفعہ سلامت ہی نہیں آتا۔ جھٹے ڈال لانا۔ بٹن توڑ دینا تو کچھ بات نہیں۔ اب اگر میں یہ شبنم کا انگرکھا اور کچّی ململ کا کرتہ اسے دے دیتا تو بس ستیاناس تھا۔ کمبختوں کو ایک خدا کی ماریہ بھی ہے کہ ہمارے کپڑے پہنتے ہیں۔ اب ہماری یہ اوقات رہ گئی کہ ان کا پسینہ ہم سونگھیں مجھ سے تو برداشت ہوتا نہیں۔ دیکھو ایک پیسے کا صابن لایا تھا۔ دونوں کپڑے کیسے جھک ہو گئے۔ تھوڑی سی محنت کرنی پڑی بلا سے خالی ہوں۔ میں نے کہا آج دھوبی ہی بن جاؤں آؤ بیٹھو۔ نچوڑ کر پھیلانے کی دیر ہے پھر تم سے باتیں ہوں گی۔

مَیں: کلپ بھی آپ دے لیتے ہیں۔

مرزا صاحب: کلپ دینے میں کون سی اُستادی کا کام ہے۔ تم نے دیکھا نہیں۔ پتیلی

میں جو میں نے ڈوب دیا تھا وہ کلپ ہی تو ہے۔

میں: اور استری؟

مرزا صاحب: اب تمہیں یہ بھی بتا دوں؟ وہ سامنے طاق میں پیتل کی کٹیا رکھی ہے۔ اس میں چار کوئلے ڈالے اور استری ہو گئی۔

اس روز میں ان کے پاس دوپہر ڈھلے پہنچا تھا۔ باتیں کرتے کرتے مغرب کا وقت ہو گیا۔ میں نے پوچھا "مرزا صاحب! کھانے کا کوئی انتظام نہیں۔ کیا کسی باورچی سے معاملہ کر لیا ہے؟" قہقہہ لگا کر کہنے لگے "میاں! وہ بڑا روزی رساں ہے اور شکر خورے کو شکر ہی دیتا ہے۔ کل رات کو فراش خانے کے پاس سے گزر رہا تھا۔ بڑیوں کے کٹرے کے سرے پر نورا نانبائی کی دکان ہے۔ ہمارے ہاں کی پخت بھی اسی کے ہاں ہوتی تھی۔ اس وقت اُس کے ہاں گرم گرم روٹیاں اُتر رہی تھیں۔ کچھ ایسی سوندھی سوندھی خوشبو آئی کہ بے اختیار چار روٹیاں لے لیں۔ نورا پشتینی ہمارے ہاں کا نانبائی۔ میری طبیعت سے بھی خوب واقف۔ بولا میاں انہیں باسی کر کے کھائیے گا۔ روٹیاں نہیں کھجلے ہیں تو بھی ایک تو میں نے رات کو کھائی۔ اب عام طور پر ایسی کون پکاتا ہے نہ جانے کس کی فرمائش ہوگی۔ ایک صبح کو باسی ہو کر دوبالا مزہ ہو گیا تھا۔ سالن پکانے کو بھی جی نہ چاہا۔ ایسی بھربھری ایسی لذیذ کہ کیا بتاؤں افسوس یہ رہا کہ چار ہی لایا۔ ایک اب کھاؤں گا۔ تم کو بھی چکھانا چاہتا ہوں۔ پانی پت کی ملائی کو بھول جاؤ گے۔

میں: (مسکرا کر) اور ایک کل صبح کو کھائیے گا؟ باسی سے دو باسی اور دو باسی سے تباسی۔

مرزا صاحب: تم لوگ بسکٹ آج کے پکے ہوئے کے کے دن تک کھاتے ہو۔ روٹی

میں کیا بجُس مل گیا ہے اور پھر اس قسم کی تندور کی روٹی میں تو باسی ہو کر خاص لذّت پیدا ہو جاتی ہے۔

یہ بھی میں نے دیکھا کہ جب کبھی سالن پکایا ہے تو پاؤ سیر گوشت میں چار ہنڈیاں پکائی ہیں۔ وہ کس طرح؟ آپ حیران ہوں گے۔ سُنئے۔ صبح کو قورمہ بھونا۔ شوربا اور ایک آدھ بڈّی سے پیٹ بھرا۔ شام کو اس میں کوئی ترکاری ڈال دی۔ ترکاری کے قتلوں سے روٹی کھائی۔ بڈّی چوسی۔ تیسرے وقت بوٹیوں کو پیسا اور شامی کبابوں کا مصالحہ ملا ٹکیاں تل لیں۔ دو کبابوں سے کام چلایا باقی جو تین بچے انہیں گول کر کے کوفتے بنائے۔ چار لذّتیں آگئیں اور چار وقت ٹل گئے۔ ایک دفعہ میری موجودگی میں کباب بنا رہے تھے۔ میں نے سوال کیا تو فرمایا۔ صاحبزادے گوشت تو ایک ہی ہوتا ہے۔ مصالحہ اور ہاتھ کی صفت سے جیسی چاہو لذّت پیدا کر لو۔ تم نے کبھی اس طرح کا کھانا کھایا نہیں۔ جس دن کھاؤ گے چودہ طبق روشن ہو جائیں گے۔ بڑے حضرت تو اکثر فرمائش کر کے قورمہ کے شامی اور شامی کے کوفتے بنوایا کرتے تھے جیسا اب ونمک اس میں رچ جاتا ہے دوسری ہنڈیا میں نہیں رچتا۔

ایک دن کا ذکر ہے حضرت نظام الدین اولیا کی سترھویں تھی۔ راستے میں مل گئے۔

مَیں: صاحب عالم آج سترھویں ہے۔

مرزا صاحب: ہاں بھئی لوگ چلے جا رہے ہیں۔

مَیں: آپ نہیں جائیں گے؟

مرزا صاحب: میاں کن پاؤں سے جاؤں۔ دل تو بہت چاہتا ہے۔

مَیں: اجی اکّے بہتیرے ہیں اور دو آنے سواری ہے۔

مرزا صاحب: دو آنے سواری ہو یا دو روپے اور میں جاؤں تو پُورا یکّہ کر سکتا ہوں لیکن

میری عقیدت کے خلاف ہے۔ ایسے بزرگ کے عرس میں اور سوار ہو کر جاؤں۔ ساری عمر جو نہیں کیا وہ اب آخری وقت میں کیا کروں۔

میں: کیا وہ نہیں جانتے کہ اب آپ پیدل چلنے کے قابل نہیں ہیں۔

مرزا صاحب: وہ جانیں یا نہ جانیں میرا دل گوارا نہیں کرتا۔

میں: اس لیے دربار کی حاضری اور فاتحہ کا ثواب بھی چھوڑا۔

مرزا صاحب: فاتحہ تو جہاں سے پڑھو پہنچ جاتی ہے۔ رہی دربار کی حاضری وہ ان سے میں نے معاف کرا لی ہے۔

غرضیکہ یہ ان کا رنگ تھا۔ کوئی کام ایسا نہیں کرتے تھے کہ آخر میں تکلیف ہو۔ اطمینان میں فرق آئے یا دوسروں کے سامنے شکلیں بنانے اور ہاتھ پسارنے کی نوبت آئے۔ لوگ کہا کرتے تھے کہ جورو بچے نہیں ہیں اس لیے جس وضع کے ساتھ چاہے گزار دیں۔ یہ بچے ایک دو بھی رونے والے ہوتے تو پوچھتے صاحب عالم کے جیسی کیسے ساٹھ؟

اتفاق سے باتوں باتوں میں ایک دن اس قسم کا ذکر بھی آگیا۔ کس اطمینان سے فرماتے ہیں کہ جو آدمی ذلیل ہوتا ہے اسے بال بچے تو کیا اپنی ذات کے لیے بھی ہزاروں ذلتیں اٹھانی پڑتی ہیں۔ میں ہمیشہ کا گھوڑا ناٹھا تو نہیں ابھی دس بارہ برس ہی تو ہوئے کہ فارغ البال ہوا ہوں۔ دیکھنے والوں سے پوچھ لو یہی ٹھاٹھ اس وقت بھی تھے۔ صاحبزادے جو آتا ہے اپنا رزق ساتھ لاتا ہے۔ مثل مشہور ہے۔ آیا آدمی آیا رزق گیا آدمی گیا رزق۔

میں: کتنے بچے تھے؟

مرزا صاحب: لٹے گاؤں کا کیا نام۔ یہاں تو جس دن سے انہیں دبا کر آئے الٹ کر یہ بھی نہ دیکھا کہ قبریں بھی سلامت ہیں یا ڈھے گئیں۔

میں: ایسے بے مروّت

مرزا صاحب: بے مروّت میں ہوں یا وہ۔ چالیس برس کے بعد بیوی دغا دے گئی پھر ظالم نے چاروں بچّوں کو بلا لیا۔ اور مجھے تو پھر بھی ان کا خیال ہے پا بہ رکاب بیٹھا ہوں سواری آئی اور چلا۔

سُنا جناب نے ان کی وضع داری۔ زندہ دلی، خوش پوشی اور بے داغ زندگی کا یہ بھید تھا کہ اپنی طبیعت پر پورا قابو رکھتے تھے۔ جب مرے ہیں تو سُنا ہے کہ ایک دن ماندے نہیں پڑے۔ خدا نے ان کے مردے کی بھی مٹی خراب نہیں کی۔ بھرم بھی بنا کا بنا رہا کسی دوست کے ہاں محفل میلاد میں گئے ہوئے تھے وہیں بیٹھے بیٹھے انتقال ہو گیا۔ صاحب محفل نے بڑی دھوم سے تجہیز و تدفین کی۔ کئی روز بعد جو لوگ مکان پر گئے تو قفل ٹوٹا ہوا دیکھا۔ گھر میں جھاڑو دی ہوئی تھی۔ جس نے سُنا یہی کہا کہ چوروں کے وارے نیارے ہو گئے۔ صاحب عالم مُفلس تھوڑی تھے۔ مرے ہوئے بیل کے بڑے بڑے ویدے۔ کوئی کہتا میں نے ہیرے پنّے یاقوت اور نیلم کی چار انگوٹھیاں دیکھی تھیں۔ کوئی کہتا موتیوں کی ایک مالا بھی تھی۔ الغرض جس طرح جیتے جی ان کی بات بنی رہی مرنے کے بعد بھی ان کا پردہ نہ کھُلا۔

کالا بجّو

آج سے کوئی چالیس پچاس برس پہلے دلی میں کالا بجو ایک مشہور گورکن تھا، ٹھگنا قد، ہاتھ پاؤں موٹے موٹے، توند نکلی ہوئی چھاتی پر بھیڑ کے سے بال۔ رنگ ایسا سیاہ جیسے تارکول کا پیپا، نہایت ڈراؤنی صورت۔ آواز بھی ایسی بھیانک کہ بچے تو بچے بڑا آدمی بھی ایک دفعہ سن کر ڈر جائے۔

گورکن یوں بھی ڈراؤنے ہوتے ہیں۔ ہر وقت قبرستان میں رہنا۔ قبریں کھودنا۔ مُردوں سے واسطہ۔ عام طور پر لوگ انہیں اچھا نہیں سمجھتے۔ ان کی صورتیں بھی مسخ ہو کر کچھ ایسی بدہیت ہو جاتی ہیں کہ دیکھنے سے ڈر لگتا ہے۔ لیکن کالا بجو تو پیٹ بھر کر ہیبت ناک تھا۔ پھر اس کے کرتوت ایسے ظالمانہ تھے کہ یہ دکھائی دیا اور لوگوں نے "جل تو جلال تو آئی بلا کو ٹال تو" پڑھنا شروع کیا۔ رات کو اگر اتفاق سے آجاتا تو دل دھڑکنے لگتا۔ دن کو بھی کئی دفعہ بعض کمزور دل اس کو دیکھ کر ڈر جاتے تھے۔

ایک مرتبہ میرے ایک رشتہ دار اپنے والد کی قبر پہ فاتحہ پڑھنے گئے۔ جھٹپٹے کا وقت تھا۔ جناب عالی یکایک ایک طرف سے نکل آئے۔ بے دھیانی میں جو ان کی نظر پڑی تو گھگّی بندھ گئی۔ فاتحہ پڑھنا کیسے الٹے پاؤں بھاگے اور گھر آتے آتے ایسا بخار چڑھا کر بڑی مشکل سے تین مہینے کے بعد کہیں جا کر ساز ٹے ہوئے۔ اسی لیے کوئی اسے قبرستان کا بھوت اور کوئی کالا بجو کہتا۔ کالا بجو اس کو یوں کہتے ہیں کہ اس نے اپنی زندگی میں ہزاروں

قبریں کھود ڈالیں تھیں۔ میت کو دفن کرنے کے لیے قبر کھودنا نہیں بلکہ دفن شدہ میت کو نکال پھینکنے کے لیے کوئی خوش نصیب میت ایسی ہوتی ہوگی جسے اس کے راج میں دو چار مہینے سُکھ ملتا ہوگا۔ چلاچلی کے دنوں میں تو تیسرے چوتھے روز ہی ظالم اپنی کارروائی کر گزرتا تھا۔

دِلّی میں غدر کے بعد تک قبرستانوں کی کوئی گنتی نہ تھی یہ تکیے کہلاتے تھے۔ شاہی زمانے میں مسلمانوں کو اپنے مُردوں کا خاص احترام تھا۔ خاندانی شرفا اور اُمراء کی اپنی اپنی ہڑواڑیں الگ الگ تھیں۔ مولوی اپنے مدرسوں مسجدوں میں دفن ہوتے۔ پیر خانقاہوں میں۔ بعض بعض لوگوں کی گھروں کے اندر ہی قبریں بنادی جاتیں۔ متبرک مزارات کے حوالی میں دفن ہونا بھی باعثِ نجات سمجھا جاتا اور یہ بات تو آج بھی ہے۔ باوجود حکومت کی طرف سے ممانعت کے لوگ نہیں مانتے۔ پُرانے قبرستانوں میں حالانکہ جگہ نہیں رہی ہے، مگر مُردوں پر مُردے ٹھونسے جاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ایک ایک قبر سے ستّر ستّر مُردے اُٹھیں گے۔ میں تو کہتا ہوں ستّر تو کیا سات سات سَو سے بھی زیادہ ہی اٹھیں گے۔ کئی قبرستان جیسے خواجہ باقی باللہ، قدم شریف وغیرہ تو ایسے ہیں کہ جب سے ان میں آبادی شروع ہوئی ہے برابر ہوتی ہی چلی جارہی ہے۔ خدا معلوم کتنی دِلّیاں اس میں سماگئی ہوں گی۔ پھر بھی خوش عقیدہ لوگ اپنے مُردے گاڑنے سے باز نہیں آتے۔ عوام الناس کی اسی خوش اعتقادی نے کالے بجّو جیسے گورکنوں کو پیدا کیا اور انہیں جرأت دلادی کہ ایک مُردہ اکھاڑیں اور دوسرا دبادیں، دوسرا نکالیں اور تیسرے کے لیے جگہ کردیں۔

عام طور پر یہاں کئی تکیے مشہور تھے حضرت خواجہ باقی باللہ کا قبرستان۔ آپ کا اصلی نام سیّد رضی الدین احمد ہے۔ باقی باللہ کا خطاب مُرشد سے ملا تھا۔ کابل میں پیدا ہوئے ظاہری اور باطنی کمالات حاصل کرنے کے بعد اکبر بادشاہ کے عہد میں ہندوستان تشریف لائے

اور دلی کو اپنا قیام گاہ بنایا، یہیں وفات پائی۔ صاحبِ فیض بزرگ تھے۔ زندگی میں ہر طرح مرجع خلائق رہے۔ وفات کے بعد بھی لوگوں نے آپ کا دامن نہیں چھوڑا۔ آپ کے پڑوس میں دفن ہونے لگے۔ چنانچہ آج تک یہ سلسلہ جاری ہے۔ اس چھوٹے سے رقبے میں لاکھوں دفن ہو چکے ہیں اور لاکھوں کو آرزو ہے۔

عارف حسین رسول شاہیوں کا تکیہ، ناگ پھنی کا تکیہ، یہ دونوں تقریباً بند ہو چکے۔ ڈین علی شاہ کا تکیہ، اس میں بھی اب کوئی نئی قبر نہیں بنتی۔ تکیہ شاہ میر، جہاں نما اور خدا نما کے قبرستان بھی عام لوگوں کے لیے بند سمجھنا چاہئیں۔ رسول نما اور قدم شریف کی بستیاں البتہ ابھی تک مُردے کھینچے جا رہی ہیں۔ کلو بخشو کے تکیئے کی حیثیت گورِ غریباں کی سی سمجھنی چاہئے حکومت نے قبرستان بنا کر چاہا تو یہ تھا کہ آئندہ یہاں کوئی مردہ دفن نہ ہو۔ لیکن دلی والے کس کی سنتے ہیں۔ آنکھ بچی اور میت کو لے پہنچے۔

اچھا نو کا نے بجّو نے دراصل اسی کلو بخشو کے تکیے میں رہ کر اوّل اوّل شہرت پائی اور نام پیدا کیا۔ یہاں کا تکیہ دار ایک تاریخی آدمی گزرا ہے۔ بظاہر تو اس کی حیثیت ایک مسکین فقیر کی سی تھی، لیکن مُردوں پر قیامت توڑنے میں شاید ہی کہیں کوئی اس کی جوڑ نکلے۔ اپنے راج میں بد معاش خدا ناترس نے مُردوں اور مُردوں کی ہڈیوں پر وہ ستم ڈھائے ہیں کہ خیال کرنے سے رُوح کانپ اُٹھتی ہے۔ یہ کالا بجّو مدتوں اس کا دایاں ہاتھ بنا رہا تھا۔ وہ تو اتفاق سے ایک پردیسی کی بیوی یہاں دفن ہوئی۔ تیسرے دن جو فاتحہ پڑھنے گیا تو کیا دیکھتا ہے کہ قبر اُدھڑی پڑی ہے اور کچھ لوگ اپنی میت لیے بیٹھے ہیں۔ پہلے تو اس کو خیال ہُوا کہ شاید میں بھول گیا ہوں آس پاس ڈھونڈتا پھرا۔ لیکن دو دن کی تازہ قبر کوئی نہ دکھائی دی۔ اتنے میں کالا بجّو دکھائی دیا اُسی نے اس کی بیوی کو دفن کیا تھا۔ اس نے پوچھا کہ "بھئی پرسوں صبح کو میری بیوی کی تم ہی

نے تو قبر بنائی تھی۔" کالے بجّو نے بڑی بے رُخی سے جواب دیا "اچھا پھر ہم تو دن رات قبریں ہی کھودتے ہیں۔"

پردیسی کہنے لگا "میں فاتحہ پڑھنے آیا ہوں، ذرا بتا دو، وہ کون سی قبر ہے؟"

کالا بجّو: دیکھ لو، تمہیں بھی خدا نے آنکھیں دی ہیں۔

پردیسی: یہاں مجھے کہیں دکھائی نہیں دیتی۔

کالا بجّو: نہیں دکھائی دیتی تو اپنی رادھا کو یاد کرو۔

پردیسی: (پریشان ہو کر ذرا آواز سے) یہ خوب بات ہے۔ پرسوں دفن کر کے گیا ہوں آج قبر ہی کا پتہ نہیں۔ میں تو جانتا ہوں کہ یہ قبر میری بیوی کی ہے۔

کالا بجّو: کہیں پاگل تو نہیں ہو گئے۔

پردیسی: ہمیں پاگل بناتا ہے۔ مرنگا پرسوں تو نے قبر کھودی ہے اور میں نے تیرے منہ مانگے سات روپے دیئے ہیں۔

کالا بجّو: پھر تم نے کون سی حاتم کی گور پر لات ماری۔ سات روپے میں تو مُردہ اتنی ہی دیر قبر میں رہتا ہے۔

پردیسی کی آواز کراری تھی۔ اس نے جو زور زور سے باتیں کیں تو جو میّت دفن ہونے کو آئی تھی اس کے ساتھ والے بھی آ گئے کہ سنیں تو معاملہ کیا ہے۔ مختصر یہ کہ فساد بڑھ گیا۔ دو آدمی چپکے سے تھانے پہنچ گئے۔ تھانے دار کو اس قسم کی رپوٹیں پہلے سے پہنچی ہوئی تھیں لیکن ہاتھ ڈالنے کا موقع نہیں ملتا تھا۔ فوراً دوڑ کر آ دھمکا۔ کالا بجّو تو دور سے پولیس والوں کی صورت دیکھتے ہی چمپت ہوا۔ پولیس والے فقیر تکئے دار کو پکڑ لائے اور مشتبہ قبروں کی دیکھ بھال شروع کر دی۔ ایک پرانی ٹوٹی ہوئی قبر میں تین لاشیں ملیں جن میں سے ایک کو

پردیسی نے بھی پہچان لیا۔ اب مقدمہ قایم ہونے میں کیا دیر تھی۔ لیکن قانونی موشگافیوں کا خدا بھلا کرے ایک سال کے بعد تکیہ دار بری ہوگیا حالانکہ شہر بھر نے اس کے خلاف گواہیاں دی تھیں۔

اچھا تو اس مقدمے کے سلسلے میں تکیے دار اور بجّو کی کچھ ان بن ہوگئی تھی اور وہاں سے اپنی بدمعاشیاں سمیٹ خواجہ باقی باللہ کے قبرستان میں آگیا اور یہاں کے متولی کے پاس جسے ہم تکیے دار کہیں گے مدتوں اپنی کارگزاریاں دکھاتا رہا۔ کیونکہ حضرت کے حوالی میں دفن ہونے کے لیے بڑی بڑی موٹی آسامیاں آتی تھیں۔ متولی دو دو گز زمین کے پان پانسو روپے لیتے تھے۔ خاص خاص قبریں تو باقی رہ جاتی ہوں گی ورنہ اگر "ماند شبے ماند شبے دیگر نمی ماند" ہم تو جب کسی میت کے ساتھ گئے کوئی چپّہ زمین کا خالی نہیں دیکھا۔ لیکن ساتھ وہیں نئے مُردے برابر دفن ہوتے جاتے ہیں۔ خدا جانے یہ کس کی کرامت ہے۔

کالا بجّو تو اندھا ہو کر جہنم واصل ہُوا۔ وہاں کے پہلے تکیے دار بھی خدا بخشے ہوسئے۔ آج کل کی خبر نہیں کہ وہاں کا کیا رنگ ہے۔ کالے بجّو نے تو ایک بزرگ کے مزار کا بھی کبھی لحاظ نہیں کیا۔ اپنی وہی اکھاڑ پچھاڑ جاری رکھی تھی۔ لوگوں کا بیان ہے کہ دفن کرنے سے پہلے وہ میّت کے وارثوں سے فیصلہ کر لیا تھا کہ قبر کیسی چاہتے ہو؟ کرائے کی یا زرخرید؟ لیکن زرخرید ہونے کی صورت میں بھی دیر سویر مُردے کی مٹی عزیز ہوتے ہی دیکھی گئی۔ سُنا ہے ایک مرتبہ کسی نے اس سے پوچھا کہ ظالم تو یہ کیا کرتا ہے تجھے خدا کا خوف نہیں آتا۔ بولا میاں صاحب اگر ایک قبر میں ایک ہی مُردہ دفن ہوتا تو ساری دلّی بارہ بارہ چوبیس برس تک قبرستان ہوتی اور زندوں کو رہنے کی جگہ نہ ملتی۔ یہ ہمارا صدقہ ہے کہ ہزاروں دفن ہوتے چلے جاتے ہیں اور برابر جگہ نکلی چلی جاتی ہے۔ اب اگر کوئی یہ چاہے کہ ظاہر میں اس کی قبر سلامت رہے تو ہم سے ہاتھ ملائے۔ جب اس کا کوئی دلی وارث آئے گا قبر موجود ملے گی۔ مگر یہ غرپُوچھئے

کہ اس میں کتنے مُردے دفن ہیں۔ اس بھید کو اللہ جانتا ہے یا ہم۔ آخر نئی قبروں کے لیے جو پُرانی قبریں اکھاڑی جائیں گی تو ان کی میتوں یا ہڈیوں کا بھی تو کوئی ٹھکانا چاہیے۔ ایسی پختہ قبروں کو گنج شہیداں کہنا چاہیے۔

موت کسی کو نہیں چھوڑتی۔ کالا بجّو بھی دوسروں کی قبریں کھودتے کھودتے ایک دن اسی زمین میں چھپ گیا۔ اور اس کی قبر کا بھی پتہ نہیں۔ حالانکہ اس کی قبر عبرت کے لئے یادگار کے طور پر رکھنی چاہیے تھی۔ لیکن گور کنوں سے اللہ بچائے۔

٭

مرزا چرکٹ

پروفیسر ادیب، العزیہ خواہ مخواہ۔ مرد آدمی جب دلی آتے اور کسی بھان متی کے کنبے میں جاتے، ایسی بھری بھری ڈکاریں لیتے کہ سننے والوں کا جی متلانے لگتا۔ میں نے کئی دفعہ ٹوکا بھی لیکن کون مانتا؛ جن میں بولتے وہ ان ہی جیسے ہوتے، شہر والے غریب اُن انگریزی صحبتوں میں کہاں جانے لگے۔ بات یہ تھی کہ انہیں اردو زبان دانی کا نہایت لمبا چوڑا دعویٰ تھا۔ فرمایا کرتے تھے کہ دلی میں اب اردو کہاں؛ خالی شیخیاں ہی شیخیاں رہ گئی ہیں۔ ٹھیٹھ دلی والے جن کو کہو ان کا تو نہ تلفظ درست ہے نہ لب و لہجہ اور بولی بھی ان کی خدا جانے کس ملک کی ہے۔ قبوتر، چکّو، ٹھرّوا، قلفی، دِن سے، دن نے وغیرہ تو ایک طرف ہزاروں لفظ ایسے بے معنی اور بے تکے بول جاتے ہیں جو نہ کسی مستند شاعر کی زبان سے سنے نہ کہیں کتابوں میں پڑھے، کیا انہی جانوروں کی بولیاں بولنے والوں پہ دلی کو ناز ہے۔

لیکن مرزا چرکٹ نے اُن کو ایسا جلاب دیا کہ رہے نام سائیں کا۔ تو ند تو گیا دماغ تک پہنچ گیا اور اب جب کبھی سامنا ہو جاتا ہے کان پکڑ لیتے ہیں کہ بھئی مرزا صاحب تو بلا نکلے۔ مارا ازیں گیاہِ ضعیف ایں گماں نہ بود۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ وہ اَن پڑھ ہوں گے کیا کیا لغت چھانٹے ہیں اور تمہارا بھی قائل ہوں۔ ڈکشنری بنے ہوئے تھے۔ آخر استاد ہونا۔ ہوا یہ کہ ایک روز بیٹھے بیٹھے مرزا چرکٹ یاد آ گئے۔ مرزا چرکٹ دیکھنے میں تو زیادہ جچاؤ کے آدمی تھے نہیں۔ پھر رہا سہا بڑھاپے اور کام کے منڈے نے بدڑا کھو دیا تھا مگر زبان مرتے مرتے ہزار داستان رہی

ان کی گفتگو سن کر بڑوں بڑوں کی سٹی گم ہو جاتی تھی پڑھنا لکھنا کیسا ساری عمر علاتے بندی کی۔ ہاں صحبتیں پڑھے لکھوں کی اٹھائی تھیں۔ بات اس طرح کرتے کہ سننے والے منہ تکتے رہ جاتے کیا مجال جو شین قاف میں فرق آئے۔ لب و لہجہ ایسا درست کہ جاہل ہونے کا شبہ تک نہ ہوتا

وضع وہی پرانی۔ موٹی ململ کا انگرکھا چھاتی کھلا۔ ایک برا پاجامہ۔ گھٹے ہوئے سر پر دو پلڑی ٹوپی منڈھی ہوئی۔ کتراں ڈاڑھی۔ بے کار تھے۔ کانوں سے اونچا سنائی دینے لگا تھا۔ مداری کی ڈنڈی پر مُنڈھیا بچھا کر بیٹھ جاتے۔ کوئی ملنے آ جاتا تو بات چیت کر لیتے ورنہ انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا کرتے۔ کچھ دن سے یہ ان کا ورد تھا۔

میری ان سے یاد اللہ تھی۔ پچھلی مرتبہ جو پروفیسر صاحب تشریف لائے اور مجھ سے ملنے آئے تو میں لپک کر مرزا چرکٹ کو بلا لایا۔ پروفیسر صاحب فیشن ایبل ادیب، حیران کہ یہ کون ذاتِ شریف ہیں؟ اشارے سے پوچھا آپ کی تعریف؟ میں نے کہا "ایرانی نسل کا بلبل ہے کبھی قلعہ میں ان کے چہچہے تھے اب وہ اڈا تو رہا نہیں فقط یہ رہ گئے ہیں۔ سنوانے لایا ہوں۔ بولے "تا لو۔ کرخنداری زبان میں نے بہت سنی ہے۔ فضول وقت ضایع ہوگا۔" مرزا سمجھ گئے کہ کچھ میری نسبت بات چیت ہے۔ ہنس کر کہنے لگے ؎

ٹھٹھوں میں کیوں اڑاتے ہو انگریزی دانوں تم
لاوارثا سمجھ کے ہمیں آنکھ مار کے
دلّی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب
ہم رہنے والے ہیں اُسی اُجڑے دیار کے

پروفیسر صاحب تو کچھ شرما سے گئے میں آواز سے بولا۔ "مرزا یہ کالج کے پروفیسر ہیں آپ سے ملنے کا انہیں بہت اشتیاق تھا۔ کچھ باتیں کیجیے۔ اردو زبان ان کی رائے میں دلّی سے چلی گئی

مرزا: سچ کہتے ہیں۔ بُرا ماننے کی کیا بات ہے۔ دِلّی والے ہی باہر چلے گئے تو زبان کس کے منہ میں بولتی۔ غدر نے بلبلوں کی ساری کابکیں اجاڑ دیں۔ قلعہ کی بادشاہی کڑک ہو کر رنگون جا پہنچی۔ امیروں کی طبلعتیں اُڑ گئیں۔ غریب جو نصیب کے گیدی تھے قبرستانوں میں جا بسے۔ شہر میں رہ گئے لُرّہ، کودن، گاؤدی۔ اُردو بازار تو کب کا چوپٹ ہو گیا۔ مچھلی والوں میں جو دکانیں لگیں گی وہاں سے "کیوڑے میں بسا ڈالی ہیں" "یا ڈلی ڈلی میں گلاب" کی تو آوازیں آنے سے رہیں"۔

مَیں: (اشارے سے) کہئے کیا سمجھے؟

پروفیسر: (گردن ہلا کر) بولتے تو بڑی صفائی سے ہیں لیکن وہی انمل، بے جوڑ الفاظ بھائی جان دلّی والوں نے اُردو کو چیستان بنا دیا ہے۔ بھلا کڑک کیا معنی۔ طبلعتیں کے کہتے ہیں، کابکیں۔ گیدی۔ لُرّہ۔ کودن۔ گاؤدی میں نہیں سمجھتا کہ اُنہوں نے صحیح استعمال کیے ہوں۔

مَیں: معلوم ہوتا ہے آپ نے کوئی لغت کی کتاب نہیں دیکھی۔

پروفیسر: کیا مطلب؟ ان سے میں کیا اُلجھوں آپ ہی فرمائیے؟

مَیں: جناب کڑک تو وہی آپ کا قُرق ہے۔ غدر کا ہنگامہ سلطنت کی قُرقی نہ تھی تو اور کیا تھی۔ اسی قُرق کو اردو والوں نے کڑک بنا لیا۔ جو مُرغی انڈے دینے بند کر دیتی ہے اسے کہنے لگے لہٰذا بادشاہ اور اُن کی بادشاہت قُرقی میں آ گئی تو سونے کے انڈے یعنی داد و دہش ختم ہو گئی۔ اس سے زیادہ صحیح لفظ اور اس کا بجا استعمال اور کیا ہو سکتا ہے طبلے پر ایک کالے رنگ کا حلقہ سا آپ نے دیکھا ہوگا اسے طبلق کہتے ہیں۔ وہ جب اُڑ جاتا ہے تو طبلے کی آواز بھی جھوجھری نکلنے لگتی ہے۔ پھر اخباروں رسالوں پر جو

پانے والے کے نام کی چھاپ لگایا کرتے ہیں اس کا بھی اصطلاحی نام طبلق ہے۔ تو امیروں کے نام ونمود کی نشانیاں ہی مٹ گئیں۔ ان کی آن بان کے طبلے کا مسالہ اُڑ گیا تو باقی کیا رہا۔

کابک لُغت میں صاف آشیانۂ مرغ کے معنوں میں ملے گا۔ رہے گیدی۔ لُر۔ کودنی اور گاؤدی کے الفاظ اُن میں اردو کا کوئی تصرّف نہیں ہُوا۔ جوں کے توں۔

پروفیسر: گیدی میں نے صرف فسانۂ آزاد میں اس بونے مسخرے کی زبان سے سُنا ہے کسی ادیب نے تو آج تک استعمال کیا نہیں۔

میں: آپ ادیبوں کی سند چاہتے ہیں یا اہلِ لغت کی؟ غیاث اللغات کو اُٹھا کر دیکھئے لکھا ہے کہ "گیدی مرکب از گید یعنی گدو یائے نسبت وگید گویند کہ شش ماہ نرو شش ماہ مادہ می گردد لہذا ہر مردے کہ رجولیت وغیرت ندارد اطلاق کنند"۔ اب کہئے جو غدر میں کتّوں کی موت مرے ان کے واسطے گیدی سے بڑھ کر کون سا لفظ آپ پسند کریں گے اسی طرح لُر وغیرہ سمجھ لو۔

پروفیسر: میں تو جانتا ہوں لُر کودن اور گاؤدی جاہلوں کی بولی ہے۔ بے وقوف لوگوں کے لیے نام رکھ لئے ہیں۔

میں: اسی پر آپ کو ادیب ہونے کا دعویٰ ہے۔ حضرت لُر ترکی لفظ ہے۔ اس کی تشریح اہلِ لغت نے کی ہے کہ طائفہ از صحرائیاں کہ از شیاطین وکنیزانِ سلیمان علیہ السلام بوجود آمدہ و بہ معنی روستائی و مردِ احمق مستعمل۔ کودن اسپ پالانے کہ بار برو نہند۔ گاؤدی میں تھوڑا سا تصرّف کر لیا ہے۔ یہ در اصل گاؤ تازی تھا۔ لاف وگزاف زدنی۔ نامرد در مقابلہ حریف۔

مرزا: بھئی اور بھی سُنا۔ کل ہی کی تو واردات ہے۔ جمّن مستری دیوار پر سول لگا رہا تھا۔ برابر والی چھت پر شیراز کے کبوتر ہیں۔ اس نے چھپکا مارا۔ جمّن نے ایک چپت دھر دیا۔ وہ بھی تھپّڑ سے پیش آیا۔ تھوڑی دیر میں کھنکے چلنے لگے۔ شیرازوں میں بڑا ایکا ہے۔ عورتیں ان کی بلا کی تتّاوہ شور مچایا کہ الاماں۔ بڑی مشکل سے بیچ بچاؤ کرایا۔ ورنہ کوتوالی میں نجانے کس کس کو گھسٹنا پڑتا۔ بیسیوں روپے کی شلقیں اُڑ جاتیں۔ پھر بھی دونوں کا پانچ پانچ روپے کا سُلفا ہو گیا۔ سپاہی صاحب کہیں سے آمرے تھے۔ دس دس روپے ان کی منہ بھرائی دینی پڑی۔ نواب بُدّھن کا چبوترہ تو تم نے دیکھا ہوگا وہیں یہ چپقلش ہوئی تھی۔ اب تک اس پر خون کے دھبّے ہیں۔

میں نے پروفیسر صاحب کی طرف دیکھا۔ وہ تیوری چڑھا کر بولے "کیا دیکھتے ہو؟ آپ کے علم میں مستری۔ سول۔ شیراز۔ چھپکا۔ چپت۔ تھپّڑ۔ کھنکا۔ ایکا۔ تتّاہ۔ کوتوالی۔ شلق۔ سُلفا، چبوترہ اور چپقلش صحیح ہیں اور ان کا صحیح استعمال ہوا ہے۔ بعض تو ان میں کسی زبان کے الفاظ ہی نہیں۔ بالکل دلّی والوں کے ایجاد بندہ ہیں۔

میں: ایجاد بندہ تو ایک بھی نہیں۔ سب کی اصل موجود ہے۔ البتہ کسی کسی کی صورت بدل گئی ہے تو یہ دنیا کی ہر زندہ زبان کرتی ہے۔ معرّب، مفرّس، مہنّد کرنے کے طریقے استادوں نے اسی لیے بنائے ہیں۔ فرگل تفاعلیوں نے فرغل بنا لیا۔ خسرو کسریٰ ہو گیا۔ پیدل۔ بیدق فرسنگ۔ فرسخ۔ گوارش۔ جوارش۔ مندیل۔ منڈاسا۔ مغل یا منگول مغل بن گئے یا جیسے چگان (فارسی) فنجان معرّب ہو گیا۔ سُکُرّہ بضمتین و تشدید را۔ کاسۂ گلی خورد (عربی)، نے سکورے راز (فارسی) نے راج (معمار) درخم نے عربی درہم۔ فارسی میں درم اور ہندوستان میں دام۔ تنگہ نے ٹکے کی شکل اختیار کر لی وغیرہ وغیرہ۔ مستری کو آپ نے شاید کوئی من گھڑت لفظ سمجھا؛

قبلہ مستری مسطر سے بنا ہے۔ مسطر سمجھے ؟ اس آلہ کو کہتے ہیں جس سے مسطر سیدھی کی جاتی ہے۔ عمارتوں میں دیوار کی سیدھ قایم کرنے کے لیے معمار جو آلہ کام میں لاتے ہیں اسے بھی مسطر کہنے لگے اور جو ماہرِ فن اس آلہ کا استعمال جانتا وہ مسطری کہلاتا۔ ہندوستان میں ط ت سے بدل گئی۔ مسطری کا مستری ہوگیا۔

پروفیسر: اچھا اسے تو مان لیا۔ آگے چلیے سول کیا بلا ہے ؟

میں: راجوں کے پاس ڈوری میں بندھا ہوا گوٹ نما ایک ترشا ہوا پتھر بھی دیکھا ہے جسے لٹکا کر وہ دیوار کی ٹیڑھ سیدھ معلوم کیا کرتے ہیں اسی کا نام سول ہے اور اسے شاقول کا مہتد یا اردو کہنا چاہیے۔

پروفیسر: اسے بھی مانا خیر۔ لیکن شیراز کو چماروں سے کیا نسبت ؟ کیا ان کی قوم شیراز سے آئی ہے ؟

میں: بھائی جان ! یہ اردو ہے لشکری زبان۔ اس کے سمجھنے کو بڑی قابلیت چاہیے لشکر میں سب ہی قوم کے لوگ ہوتے تھے۔

پروفیسر: (جلدی سے) شیراز کے موچی بھی ہوں گے۔

میں: جلدی نہ کیجیے۔ یہ بات نہیں۔ وہاں جوتے بنانے والے بھی ہوتے تھے اور گھوڑوں کا چار جامہ وغیرہ بھی تیار کرنے والے بھی۔ عربی میں گھوڑوں کے ساز و سامان بنانے والے کو سراج کہتے ہیں۔ سراج سے بگڑ کر شیراز ہوگیا اور اب ان کی ذریات شیراز کہلانے لگی۔ یہ عام چماروں سے ذرا اونچے ہیں۔

پروفیسر: خوب۔ مگر باقی الفاظ تو ضرور من گھڑت ہیں۔

میں: یہ آپ کی بے خبری ہے۔ چھپکا دراصل تخبکہ دامِ صیاد تھا۔ اردو میں چھپکا بن کر

دامِ کبوتر بازاں ہو گیا۔ تھپڑ کی اصل ترکی لفظ تپلیق ہے۔ طمانچہ کے معنی میں چپت چپات کی تصغیر ہے کہ در فارسی طپانچہ را گویند اور سنیے دلی میں آپ نے کھانے میں چپاتی تو دیکھی ہوگی چپاتی کا لفظ بھی ٹھیٹھ فارسی اور اسی چپات سے نکلا ہے۔ اہلِ لغات لکھتے ہیں کہ نانِ تنک فطیری منسوب بہ چپات است۔ چوں ضربِ دست بہ نسبتِ کلیچہ زیادہ می خواہد لہٰذا چپاتی گفتند۔ رہا کھٹکا، ایکا وغیرہ ان کے متعلق بھی سن لیجیے۔ ترک عصائے کوچک کو کتکہ کہتے ہیں عوام کی زبان پر چڑھ کر کتکہ کھٹکا ہو گیا۔ ایکا کے معنی انبوہِ درختاں ہیں۔ اردو والے اتحاد و اتفاق کے معنی میں بولنے لگے۔ کیوں کتنا صحیح تصرف ہے؟ ننتاہ شطاحی سے پیدا ہوا۔ شطاحی کے معنی ہیں بے حیائی اور شوخی۔ اردو والے زبان کے بھوکے تھے ح کھا گئے اور ط ت سے بدل دی۔ اب ننتاہ کے معنی میں زبان زور اور بے شرم عورت کے۔ کوتوال ہندی کوٹھ وال قلعہ یا شہر کے محافظ کا تغیر سمجھو۔ تلق شلاق کی تصغیر بھی ہو سکتی ہے اور تھلک بھی، شلاق بالفتح و تشدید لام لفظِ ترکی است۔ بزور دست زدن بر سر کسے و کسے را نخواب زدن۔ اور تبلک بالکسر و تشدید لام و مکسور۔ آواز چاہ بندوق کہ یہ یکبارگی سر و ہند ترکی اعراب کا ذرا سا تغیر اور ک کو قاف سے بدل دینا کوئی خاص بات نہیں۔ غیر زبان میں یہ تبدیلیاں معمولی ہیں۔ چپقلش بھی ترکی لغات میں موجود ہے۔ جنگِ شمشیر کو کہتے ہیں۔ چوترہ کو آپ غالباً سمجھے ہوں گے کہ غلط بولے ہیں چبوترہ کہنا چاہیے۔

پروفیسر: کیا چوترہ گنواروں کی زبان نہیں؟

میں: چبوترہ ہندی ہے اور چوترہ فارسی مگر اتفاق دیکھیے چبوترہ فصیح سمجھا جاتا ہے اور چوترہ غیر فصیح۔ چوترہ گنوار بولتے ہیں اور چبوترہ پڑھے لکھے۔

پروفیسر: شلغا بتائیے تو جانیں۔ یہ تو حقہ بازوں کی اپنی گھڑت ہے؟ جب سنا بھگڑول

چرسیوں یا کرخنداروں سے سُنا کہ سُلفا بھر لائیو۔ توے کو کون کھینچے گا۔ کسی عالم فاضل کو تو سُلفا کہتے سُنا نہیں۔

میں: اوّل تو اس سے لغت کی اصلیت فنا نہیں ہو جاتی۔ دوسرے سُلفا ایک ایسا چھپا ہُوا لفظ ہے کہ غالبًا اکثر پڑھے لکھے بھی بے خبر ہیں۔ خاص کر ان معنوں میں دراصل ناشتے کے طور پر جلدی جلدی جو کھانا تیار کر کے مہمان کے سامنے رکھ دیا جائے عربی میں سُلفہ کہتے ہیں۔ عربی کے اس سُلفے نے ہمارے دسترخوان پر تو جگہ پائی نہیں لیکن اِدھر اُدھر پھرتے پھرتے ایک ہزار برس بعد یاروں کی محفل میں آ موجود ہوتے۔ ہندوستان کے اوّل رنگیلے بادشاہ نورالدین جہانگیر کے زمانے میں تمباکو امریکا سے آیا۔ دربار میں پیش ہوا۔ شاہی ہونٹوں نے اسے منہ لگانا چاہا۔ حاکم کی خواہش۔ حکیم گیلانی حکمت کے پتلے۔ انہوں نے دماغ لڑا کر حقّہ نَے، چلم، پانی توے کا انتظام کیا۔ گویا تمباکو کی مضرات کو سمو دیا اور پیچوان کی صورت تیار کر کے حاضر کیا۔ بادشاہ کی دیکھا دیکھی اُمرا میں تمباکو نوشی کا شوق ہُوا۔ دوسرے حکیموں نے بھی حکمتیں لڑائیں طرح طرح کے حقّے اور قسم قسم کے نیچے بن گئے۔ مگر یہ سب امیروں کے چونچلے اور امارت کی باتیں تھیں۔ اس کی تیاری میں بڑے وقت بڑے سامان اور پورے اہتمام کی ضرورت۔ غریبوں کے پاس نہ وقت نہ سامان اور نہ شوق پورا کرنا لازمی۔ انہوں نے دستِ خود اپنے ہاتھ سے جھٹ پٹ سُلفے پر دم لگانے شروع کیے۔ عربوں نے بھوک کی جھونجھ کو کم کرنے کے لیے جو منہ جھٹالنے کو کھاتے ہیں اسے سُلفا کہا تو ہندوستانیوں نے حقّہ کی طلب مٹانے کو بغیر توے کے تمباکو پینے کا نام سُلفا رکھا۔ پھر اُردو میں سُلفا کر دینا۔ سُلفا اُڑ جانا محاورے بن گئے یعنی جس طرح سُلفے کا حصّہ دس پانچ دم لگانے کے بعد ختم ہو جاتا ہے اس لیے جو دولت جلد صرف کر دی جاتے اسے سُلفا اڑا دیا یا سُلفا کر دیا بولنے لگے۔

پروفیسر: کیا خوب۔ بھئی آج معلوم ہوا کہ اُردو بے مایہ نہیں اور ہمیں واقعی مغالطہ ہے۔ مجھے تو تمہاری تشریح سے حیرت ہوگئی۔ مرزا سے کہو کہ کوئی اور بات سُنائیں۔ ایسے آدمی اب کہاں۔

مرزا: آپ کے دوست کیا کہتے ہیں۔ بھئی ذرا پکار کر بولو تو ہم بھی سُنیں۔

مَیں: آپ کی زبان کی بہت تعریف کرتے ہیں

مرزا: یہ آپ مجھے کوک رہے ہیں۔ تعریف کیا، کہتے ہوں گے یہ بے سُرا الاپیا کہاں سے بُلا لیا۔

پروفیسر: آپ کیا فرماتے ہیں جناب۔ آپ سے مل کر تو میرے دل میں اُردو کی ایک نئی عظمت قائم ہوگئی۔ کچھ اور فرمائیے۔

مَیں: ادیب صاحب! آپ نے کیا سُنا؟ کوک سمجھے؟

پروفیسر: آپ نے ایسا مجھے جاہل سمجھ لیا ہے۔ گھڑی گھنٹے کو کوکنا یا کوئل کی کوک یہاں شاید انہوں نے چابی دینے کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ مطلب یہ کہ آپ مجھے چابی لگا کر گرمانا چاہتے ہیں۔

مَیں: مطلب تو آپ صحیح سمجھے مگر لفظ کوک آپ کے خیال میں شاید اُردو کا اپنا ساختہ پرداختہ ہوگا۔

پروفیسر: اور کیا۔ البتہ اس نے رواج اتنا پالیا ہے کہ مجھے زیادہ اعتراض کی گنجائش نہیں۔

مَیں: شاید جناب کو یہ علم نہیں کہ کوک صاحب کی اصل نسل ترکی ہے اور لطف یہ کہ بالکل انہی معنوں میں "یعنی آوازے بلند وہم آہنگ کردن سازے" گویا کوئل کی کوک

بھی آگئی اور گھنٹے کی کوک بھی۔

مرزا: اب سنتے ہو یا آپس میں باتیں کیے جاؤ گے۔

میں: جی ہاں ارشاد!

مرزا: یوسف بیگ کو جانتے ہو جو دو برس ہوئے دلی سے ہجرت کر گئے۔ بھلا کون ہیں؟

میں: سنا ہے ان کے بزرگوں کا قلعہ میں بڑا دور دورہ تھا۔

مرزا: میاں قلعہ مر گیا۔ جاننے والے مر گئے جس کا جی چاہے رئیس بن جائے جس کا جی چاہے سئیس۔ ہم سے پوچھو۔ ان کے دادا پہلے شاہی کبابیوں میں تھے پھر نوکری چھوڑ وہیں نہاری کی دکان کر لی۔ ان کا ایک بیٹا تھا ایک بیٹی۔ بیٹے نے شاہزادوں کی صحبت میں پتنگ بازی سیکھ لی اور اس میں ایسا ریاض کیا کہ بڑے نامی گرامی استاد ہو گئے۔ استاد گولنداز کا نام سنا ہے؟ بے مثل کنکوا لڑاتے تھے۔ ان کی پتنگ صیدی کے کنکوے پر ایسی گرتی تھی جیسے توپ کا گولا۔ اسی سے وہ گولنداز مشہور ہوئے ورنہ انہوں نے کیا توپیں چلائی تھیں خوب دولت کمائی۔ ایک اشرفی پیچ تک لڑایا۔ بیٹی کا کیا پوچھتے ہو ایسی چلبلی عورت دیکھی نہ سُنی کہنے کو تو اس کی شادی ایک شاگرد پیشہ سے ہو گئی لیکن سارے قلعہ میں اس کی باتیں دوڑتی پھرتی تھیں۔ اس کا نام بتا دوں؟ دنگ رہ جاؤ گے۔ تمہارے پڑوس ہی میں تو مری ہے۔ "شوقہ"

میں: شوقہ مرزا یوسف کی پھوپھی تھی؟

مرزا: جی ہاں۔ یہ مرزا کہاں سے ہوئے۔ مردھے ہیں مردھے! باپ کی دولت ہاتھ لگی۔ پھوپی کی کمائی دبا بیٹھے۔ امیر ہو گئے اور امیر ہونے کے بعد جو جی چاہے بن جائیں۔ نہ کوئی زبان پکڑتا ہے نہ ہاتھ۔

پروفیسر صاحب کو اس قصّے سے کیا واسطہ تھا اور ہونا بھی نہیں چاہئے۔ وہ تو پنسل سے کاغذ پر مرزا کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ نوٹ کر رہے تھے۔ بات ختم ہوتے ہی بولے۔ اجازت ہو تو کچھ عرض کروں"۔

مَیں: شوق سے

پروفیسر: جناب یہ سئیس کس زبان کا لفظ ہے؟

مَیں: ٹھیٹ عربی۔ لغت میں سیاست کے معنی ہیں جانوروں کی دیکھ بھال اور نگرانی اسی سے اُمرا کی اپنی جماعتوں اور سلاطین کی اپنی رعایا کی نگرانی اور خدمت کا مفہوم پیدا ہوا۔ ظالم بادشاہوں کے ظلم اور اُمرا کی خودغرضیوں نے اس کے معنی بدل دیئے۔ جس سے سیاست کردن سزا دینے اور اردو میں قہر و غضب کے معنی میں استعمال ہوا۔

ہماری زبان میں سائیس یا سئیس کا لفظ بھی اسی سیاست سے بنا ہے۔ اس کی اصل سائس ہے مگر پیشے اور نوکری کے لحاظ سے سائیس یا سئیس کا یہ مفہوم خالص ہندوستانی ہے نہ عربی نہ فارسی۔ تاہم نام رکھنے والے کو داد دینی چاہئے۔ سیاسی اور سئیسی دونوں کی اصل ایک ہی ہوئی۔ دونوں نگرانی اور نگہبانی کرتے ہیں بلکہ لغوی معنی اور ترکیب کے لحاظ سے سئیس زیادہ فصیح ہے۔

پروفیسر: لاحول ولاقوۃ۔ تو یہ جتنے سیاسی آدمی ہیں سئیس ہوئے؟

مَیں: کیا شک ہے!

پروفیسر: اور یہ کباب، کبابی کیا بلا ہے؟ ہندی تو ہوگا نہیں۔ اس لئے کہ یہاں گوشت کون کھاتا تھا۔ اسے ترک لائے یا ایرانی

مَیں: نہ ترکی نہ ایرانی۔ عربی میں 'کب' اوندھا کرنے کو کہتے ہیں۔ اب جس گوشت کو

اوندھا کر کے آگ پر رکھنے وہی کباب ہے۔ لیکن اسے اردو کی پیداوار یا جدّت کہنا چاہئے صورت عربی کی اور معنی عربی نہیں۔

پروفیسر: نہاری تو وہی تا جو دلّی کا خاص تحفہ ہے۔ بلا کی مرچیں ہوتی ہیں۔ فارسی میں دیکھا نہیں۔ عربی لفظ اس شکل کے نہیں ہوتے۔ پھر یہ کیا کسی ہندی لفظ سے بگاڑ کر بنایا ہے؟

مَیں: نہار سُنا ہوگا جیسے نہار منہ۔ یہ بھی فارسی ہے مگر معلوم نہیں ہوتا۔ اس کی اصلیت 'ناہار' ہے۔ نا نفی کا اور ہار کے معنی غذا کے ہیں۔ یعنی نہیں کھایا ہوا۔ ناہار سے نہار ہوا اور پھر نہاری بنی جو صبح کو نہار منہ کھائی جاتی ہے۔

پروفیسر: یہ ریاض کا لفظ میں نے کسی پڑھے لکھے کی زبان سے تو سُنا نہیں۔ لغت میں بھی تلاش کیا تھا۔ مجھے تو محنت مشقت کے معنی میں کہیں ملا نہیں۔ روضہ کی جمع ہے۔

مَیں: "بسیار سفر باید تا پختہ شود خامی"۔ بندہ نواز یہ اُردو ہے۔ اس کے ہر لفظ کے لیے الفاظ کی تاریخ دیکھی جاتی ہے۔ ریاضیات جانتے ہیں؟

پروفیسر: پھر اس سے اس کا کیا تعلق؟

مَیں: عربی میں روض کے دو معنی ہیں (۱) زمین کی سرسبزی و شادابی جس سے روضہ مرغزار اور باغ بنا (۲) سواری کے جانوروں خاص کر گھوڑوں کا سدھانا اور پھیرنا اور یہ بھی شاید آپ جانتے ہوں گے کہ عربی میں فعالہ کا وزن پیشے، فن اور صنعت کے کام آتا ہے تو روض سے ریاضہ بن کر گھوڑے پھیرنے کا فن یا پیشہ پیدا ہوا۔ منہ زور جنگلی گھوڑوں کو پھیر کر سیدھا اور شائستہ بنانے سے صوفیا نے نفس بدلگام کو رام کر کے مہذب بنایا اور ریاضتِ روحانی نام رکھا۔ دنیا میں اکیلے صوفی تو تھے ہی نہیں۔ گوشت پوست اور جوڑ بند کے حسن پرستوں نے جسمانی تربیت اور ورزش کو ریاضت جسمانی۔ اہلِ علم کیوں چُپ رہتے انہوں نے حساب و

ہندسہ وغیرہ مشقی علوم کو ریاضیات کا خطاب دے دیا۔ جاہل اہل پیشہ نے سوچا کہ ہم کو بھی اپنے کاموں میں محنت کم نہیں پڑتی۔ وہ اپنی صنعت کاری اور دیدہ ریزی کو ریاض کہنے لگے۔

پروفیسر: لیکن لفظ تو اردو کا اپنا ہوا۔

مَیں: ہاں! اس معنی میں یہ خالص ہندوستانی ہے۔

پروفیسر: اسی طرح صیدی بھی ہوگا۔

میں: صیدی رقیب اور مدِمقابل کے معنی میں ہندوستانی سمجھنا چاہئے۔ لیکن اصل اس کی عربی کا لفظ صید ہے۔

پروفیسر: دولت کے معنی بھی غالباً لغت میں روپئے پیسے کے نہیں۔

میں: دولت کے معنی عربی میں ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں جانا ہیں۔ عربوں میں جب مختلف سلطنتیں ایک کے بعد دوسری بنیں اور مٹیں یعنی ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں گئیں تو سلطنت کو بھی دولت کا نام دیا گیا اور اس کی جمع دول بنائی۔ آج بھی دولتِ برطانیہ اور دولِ یورپ ہم بولتے ہیں۔ سلطنت اور بادشاہی خوش نصیبی سے ہاتھ آتی ہے۔ اس لئے ایرانی دولت کو خوش قسمتی کے معنی میں بولنے لگے۔ بدولت کا لفظ فارسی میں جس کا گواہ ہے۔ اور ہماری اُردو میں بھی بدولت بولتے ہیں۔ جیسے آپ کی بدولت یہ ملا۔ اس کے بعد بدولت ذریعہ کے معنی میں ہوگیا۔ اب خوش نصیبی کی بڑی نشانی زر و مال تھا۔ اس لیے یا اس سبب سے کہ روپیہ پیسہ بھی ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل ہوتا رہتا ہے اسے بھی دولت کہنا شروع کر دیا اور دولتمند۔ دولتمندی وغیرہ کئی لفظ اردو میں بن گئے۔

پروفیسر: اچھا یہ اشرفی کس مادے سے نکلی ہے۔ شرف اس کی اصل ہوگی۔

میں: نگاہ تو خوب پہنچی۔ کسی کا یہ مقولہ یاد آگیا ہوگا کہ ”اشراف آں است کہ اشرفی دارد“

پروفیسر: کیا میرا خیال غلط ہے؟

میں: سونے کے سکے کے لئے اشرفی کا لفظ ہندوستان میں نورالدین جہانگیر کے زمانے میں ہوا ہے اور ہندوستان میں کیا آج سے چھ سو برس اُدھر اشرفی کہیں سننے میں نہیں آتی ۸۲۵ھ اور ۸۴۱ھ کے درمیان مصر کے چرکسی بادشاہوں کا ایک شاہی لقب الملک الاشرف تھا۔ یہی اشرف اشرفی کی پہلی ٹکسال یا معدن و مخرج ہے۔

پروفیسر: دولھا کے جلوس کے معنی میں برات کا لفظ کہاں سے آیا۔ ایرانیوں سے پوچھا وہ کانوں پر ہاتھ رکھتے ہیں۔ عربی نہیں، سنسکرت والے بھی اس کا کھوج غالباً نہیں لگا سکے۔ اور بولا جاتا ہے تقریباً کم و بیش سارے ہندوستان میں۔

مَیں: میری تحقیق میں یہ بر = دولھا اور آت ہے = آتا ہے کا مرکب ہے۔ ایک لفظ نہیں۔ کثرتِ استعمال نے 'ہے' کو اڑا کر برات کر دیا۔

پروفیسر: واللہ! خوب پتا لگایا۔

مَیں: لیکن آپ نے یہ جلوس کیا بولا۔ کیا اس معنی میں جلوس کا لفظ لغت کی رُو سے صحیح ہے؟

پروفیسر: کیا فرمایا؟ جلوس کے یہ معنی نہیں؟

مَیں: جلوس کے معنی ہیں نشستن

پروفیسر: پھر یہ معنی وضعی ٹھہرے۔

میں: ہاں۔ ایک بادشاہ کی جگہ جب دوسرا بادشاہ تخت پر بیٹھا تو اس کے لئے عربی کا لفظ جلوس غیر عربوں نے استعمال کیا اور سالِ جلوس تخت نشینی کے سال کی اصطلاح بنی اور چونکہ جب نیا بادشاہ تخت پر بیٹھتا تو تزک و احتشام لاؤ لشکر کے ساتھ نکلتا۔ اس لئے ہم لوگ

بادشاہ کی سواری کو بھی جلوس کہنے لگے اور اس کے بعد ہر مجمع جو بھیڑ بھڑکے سے نکلے جلوس نام ہوگیا۔ پھر جب بادشاہ یا حاکم دربار میں بیٹھے تو ہم نے اجلاس بنالیا جس کے اصلی معنی بٹھانے کے ہیں اور اجلاس کو عربی سے کوئی تعلق نہیں۔ اسی طرح جس جگہ بیٹھیں عربی میں اسے مجلس کہتے ہیں۔ بعض علما اور صوفیہ نے یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ خاص دنوں میں بیٹھ کر لوگوں کو وعظ و نصیحت کرتے یا درس دیتے۔ چنانچہ اس قسم کی نشستوں اور پھر اُن نشستوں کی تقریروں کو مجلس کہنا شروع کر دیا مجلس ہمارے ہاں ایسی نشستوں کو کہتے ہیں جہاں لوگ مذہبی اور علمی تقریریں کریں یا مرثیے پڑھیں۔ ان مجلسوں میں چونکہ حفظِ مراتب اور سلیقے کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا، بات چیت کرنا ضروری تھا اس لیے یہیں سے علم مجلسی کی بنیاد پڑی جس میں نہایت شائستگی سے مجلسوں میں نشست و برخاست۔ گفتگو کا سلیقہ اور ملنے کے ڈھنگ سکھائے گئے

پروفیسر: اور جناب اس شاگرد پیشہ کا ماخذ کیا ہے۔ کیا استادوں پر کبھی ایسی آئی تھی کہ نوکروں چاکروں کے برابر ہو گئے تھے۔

میں: استاد شاگرد کی بھی آپ نے خوب کہی۔ شاگرد بمعنی شاہی خدام۔ اصل میں شاہ گرد ہے۔ یعنی بادشاہ کے ارد گرد رہنے والے۔ عربی میں ان کے لیے حواشی کا لفظ ہے پیشے کے معنی یہاں والے کے سمجھو یا یہ کہ بادشاہوں کے ہاں اس قسم کے خدام باپ کے بعد بیٹا اور بیٹے کے بعد اس کا بیٹا ہوا کرتا تھا۔ اس لئے ان کے خاندان کو شاگرد پیشہ کہنے لگے۔

پروفیسر: تو یہ کہئے کہ اردو میں جتنے الفاظ ہیں وہ ہیں تو کسی نہ کسی علمی زبان کے لیکن معنی کے لحاظ سے نہ انہیں عربی کہہ سکتے ہیں نہ فارسی۔ ہندی ہیں۔

میں: اردو کی وسعت اس ترکیب کے سوا بڑھ کس طرح سکتی تھی اور یہ ایک اردو پر

کیا منحصر اور زبانوں میں بھی اس کی مثالیں موجود ہیں۔ دہشت فارسی میں تعجب وحیرانی کے معنی میں ہے اور استعمال ہوتا ہے خوف کے معنی میں۔ مَبلغ اصل معنی میں کسی حد تک پہنچا ہوا استعمال کرتے ہیں روپیوں کی تعداد میں جیسے مبلغِ خطیر۔ ماتم = میّت پر غم کرنے کے لئے جمع ہونے کی جگہ۔ لیکن کہتے ہیں میّت کے غم کو۔

تشکیل کے معنی ہیں ہم شکل کے اور بولتے ہیں خوبصورت کی جگہ۔ ایک نہیں ہزاروں لفظ ہیں کہ جب ایک زبان سے دوسری زبان یا ایک ملک سے دوسرے ملک میں آئے کبھی صورت اور معنی دونوں بدل گئے کبھی صرف معنی اور کبھی فقط صورت۔ صورت کی تبدیلی کے فندق سے کندہ (بندوق) کمند سے کدال۔ ولیدہ سے دلیا۔ سترنج سے ست نجا۔ مندک سے مندہ بمعنی کساد و ناروائی متاع وغیرہ گواہ ہیں۔ معنی کے لحاظ سے تو کچھ ٹھکانہ ہی نہیں۔

غصّہ عربی میں حلق میں کسی چیز کے اٹک جانے یا اَچھو ہو جانے کو کہتے ہیں اردو میں اس کے معنی غیظ و غضب ہو گئے۔

خفا فارسی میں خفہ ہے بمعنی گلے میں اٹکنے اور پھنسنے کے۔ ہمارے ہاں خفا ہونا ناراض ہونے کو کہا جاتا ہے۔

اثر کی جمع بہ قاعدۂ عربی آثار ہے اور اثرات اردو عربی میں آثار کے معنی جو کچھ بھی ہوں اردو میں لفظ اثر کی یہ دونوں جمعیں الگ الگ معنوں میں استعمال ہوتی ہیں۔ آثار کے معنی قرینے کے لئے جاتے ہیں۔ جیسے آثار یہ تھے۔ آثار سے یہ معلوم ہوتا ہے اور اثرات نتیجے کے معنی میں۔

قاعدہ عربی میں بنیاد کو کہتے ہیں۔ اس کی جمع قواعد اردو میں دو معنی رکھتی ہے۔ جمع بولیں گے تو اصول کے معنی میں اور مذکر۔ مفرد بولیں تو فوجی قواعد اور مؤنث۔

اب کے مرزا چرکٹ کو ہماری باتیں کسی قدر ناگوار معلوم ہوئیں اور کیوں نہ بُری معلوم ہوتیں یہ بھی کوئی انسانیت تھی کہ ایک بھلا مانس بیٹھا ہوا منہ دیکھے اور ہم اس سے اپنے مطلب کے سوا کوئی بات نہ کریں کھڑے ہو کر کہنے لگے تم تو اپنی روٹیاں آپ ہی چپڑ رہے ہو مجھے ناحق میر بگوّ بنا کر بٹھا دیا ہے۔ اچھا جناب تخنیت تصدیعہ، او رہ یہ جا وہ جا۔ لاکھ آوازیں دیں کون سنتا تھا۔ پروفیسر صاحب کی تو سٹّی گم تھی۔ مجھے بھی اس دن کاوش تو بہت زیادہ کرنی پڑی لیکن پروفیسر صاحب کے ختنے ایسے ڈھیلے ہوئے کہ پھر انہوں نے آج تک اردو زبان دانی کا دعویٰ نہیں کیا۔

ﮐ

مرزا آٹے

نام تو خورشید جمال تھا لیکن مشہور تھے مرزا چرمٹی۔ سر کے بال بہت کالے اور منہ لال چقندر سا قلعہ والے پھبتی باز مرزا چرمٹی کہنے لگے۔ شہزادوں کو آخری وقت میں اور تو کچھ کام رہے نہ تھے بازیاں ہی بازیاں تھیں۔ انہی میں ایک پھبتی بازی بھی تھی حضور بھی کبھی کبھی طبع آزمائی فرماتے تھے۔ جن خورشید جمال کا ہم نے نام لیا ہے یہ شہزادے نہیں بلکہ سلاطین زادے تھے۔ وہ بھی دور پرے کے۔ لوگ تو کچھ اور بھی کہتے ہیں۔ بہر حال اس میں شک نہیں کہ پیدا قلعہ میں ہوئے۔ ان کی حیثیت ان کا ناک نقشہ، سارے خاندان کیا قلعہ کے عورت مرد سے ملتا جلتا نہ تھا۔ اس لئے بڑے حضرت ان سے اکثر مذاق فرمایا کرتے۔ مرزا چرمٹی نام بھی انہوں نے رکھا تھا۔

بادشاہت جب تک رہی جیسی ٹوٹی پھوٹی بھی تھی۔ قلعہ کے رہنے والے کوئی بھی سہی، اپنی اپنی حیثیت اور تعلّق کے مطابق موجیں اُڑاتے رہے لیکن غدر کے بعد ان کے کن ٹوٹ گئے۔ وارث پر کیا زوال آیا بندھا ہوا شیرازہ بکھر گیا۔ سب اپنی اپنی ڈفلی بجانے اور اپنا اپنا راگ گانے لگے۔ کسی کو کچھ آتا جاتا تو تھا نہیں کہ آبرو کے ساتھ زندگی گزارتے۔ طرّہ یہ کہ عیش وعشرت اور بازیاں گھٹی میں پڑی ہوئی تھیں۔ ان عادتوں نے رہا سہا بھی کھوج کھو دیا پرانی دیگ کی کھرچن جب تک رہی چاٹا کئے، اس کے بعد اللہ بیلی تھا۔ بعض تو اکڑتے ہی اکڑتے اور تخت کی قسم کھاتے ہی کھاتے مر گئے۔ بعض جو ذرا سخت جان تھے ان کا وہ لکھا پڑھا

ہوا کہ خدا نہ دکھائے۔ رنڈیوں کی چلمیں بھرتے، بھیک مانگتے ہم نے دیکھا ہے۔

مرزا چرمٹی پر جب یہ نوبت آئی تو انہوں نے بھی یہی وطیرہ اختیار کیا۔ کبھی کھاتے پیتے گھروں پر جا دھرنا دیتے۔ آواز اچھی تھی کبھی قوالوں میں مل جاتے اور کبھی طوائفوں سے ساز باز کرنے لگتے نیلم، پنّا دو رنڈیاں تھیں۔ ماں کے پیٹ سے دونوں سگی بہنیں، جوانی میں ان کی بڑی دھوم تھی۔ قلعہ تک ان کے چاہنے والے موجود تھے، خوب دولت سمیٹی، لکھ پتی بن گئیں عمر کا اتار ہوا تو کوٹھے سے اُتر کر گھر میں بیٹھ گئیں۔ مشہور تھا کہ تائب ہو گئی ہیں۔

مرزا چرمٹی سے ان کی یاد اللہ تھی۔ جب جاتے بڑی خاطریں ہوتیں۔ پہلے تو دور کی صاحب سلامت ہو گی۔ اب جو قربت کا موقع ملا تو محبت کا جھولا پڑ گیا وہ محبت کی بھوکی اور یہ چھپاتے ہوتے بلبل۔ رفتہ رفتہ ایسے پینگ بڑھے کہ چھوٹی بہن نیلم سے نکاح ہو گیا۔

رتّی جب چمکنے پہ آتی ہے تو ایسی چمکتی ہے کہ اندھیری رات میں آسمان کا تارا بھی کیا چمکے گا۔ دوسرے ہی برس لڑکا پیدا ہو گیا۔ صورت نہ باپ کی بُری تھی نہ ماں کی بچہ جو پیدا ہوا تو خاصا حسین عیب رہا تو صرف اتنا کہ آنکھوں سے بھینگا تھا۔ بڑی دھوم دھام تھی۔ خوب خوشیاں منائی گئیں لیکن اللہ میاں کے کام تو کچھ نرالے ہی ہیں۔ چلّہ نہانے کے بعد ماں کو جو بخار چڑھا تو غسل کے تختے پر اترا۔ بہن کو بہن کا ایسا دھکا ہوا کہ آٹھویں دن وہ بھی چل بسی، مرزا چرمٹی کی آنکھوں میں تھوڑی دیر کے لئے تو ضرور اندھیرا آ گیا۔ اس لئے کہ سوا مہینے کے بچے کو پالنا آسان نہ تھا اور اپنی بیاہتا بیوی کے پاس لے جاتے ہوئے گھبراتے تھے۔ برس سوا برس تک اس کی بات نہیں پُوچھی تھی۔ اب جو سوکن کی علامات لے کر جاتا تو کس منہ سے۔ وہ نہ کہتی کہ جہاں ساری رات گنوائی وہیں جاؤ۔ میں گندے شوربے کی اس گندی بوٹی کو کیوں پالوں لیکن گھر جائے بغیر چارہ بھی نہ تھا۔ کئی دن کی ہچر مچر کے بعد جب بچے کی جان کا خطرہ پیدا ہونے لگا تو ناچار ڈرتے ڈرتے

گھر پہنچے۔ اتفاق سے کنڈی کھلی ہوئی تھی۔ سقہ ابھی پانی ڈال کر گیا تھا۔ بچے کو کندھے سے لگائے اندر داخل ہوئے۔ بیوی یا تو اس وقت کچھ نیکی کے دموں میں ہوگی یا یہ کہ پرانے زمانے کی بہو بیٹی شریف زادی تھیں۔ میاں کو اچانک دیکھ کر بھونچکا ہوگئیں۔ بولیں تو صرف اتنا کہ "کیوں مرزا صاحب وہاں کیا تکلیف پہنچی جو اِدھر کا رُخ کیا۔ ڈرتے کیوں ہو، میں کیا کہتی ہوں۔ آؤ آؤ جم جم آؤ۔ یہ کندھے سے لگا کر کیا لائے؟"

مرزا چرمٹی: خفا نہیں ہوگی۔

بیوی: خفا ہو کر کیا تمہاری گدھی چرالوں گی۔ میں تو صابر بندی ہوں۔ میرا تو اللہ پر بھروسا ہے۔

مرزا چرمٹی: مگر مجھے تم سے ڈر لگتا ہے۔

بیوی: چلو۔ مجھ کو یہ چوچلے نہیں بھاتے۔ زیادہ باتیں نہ بناؤ۔ ایسے تم مجھ سے ڈرنے والے۔ میرا کیا تمہیں تو خدا کا بھی خوف نہیں۔

مرزا چرمٹی: سچ کہتا ہوں، مجھ سے زیادہ تو خدا سے ڈرنے والا کوئی ہوگا بھی نہیں۔

بیوی: اے کیوں نہیں۔ اچھا اب انگنائی میں سے تو اندر آؤ۔ دیکھوں کیا سوغات لائے اور میں نے سُنا ہے نجانے کون کہتا تھا کہ تمہاری وہ مرگئی ہیں۔

مرزا چرمٹی: تم کو تو یہ سُن کر خوشی ہوئی ہوگی۔

بیوی: نہ مجھے اس مالزادی کے جینے کا رنج تھا نہ مرنے کی خوشی۔ وہ مرگئی تو تمہاری جوانی میں کون سا بجوگ پڑا۔ اِن چھل پائیوں سے شہر بھرا پڑا ہے۔ کسی دوسرے کو بٹھے پر جا کود و گے۔

مرزا چرمٹی: ارے بی مرنے والی کو اب کیوں بُرا بھلا کہتی ہو جو ہونا تھا ہوچکا۔ اس غریب کی کیا خطا۔

بیوی: اللہ تیرا شکر۔ آج تم نے وہ بات کہی ہے کہ دل خوش ہوگیا۔ سچ ہے اپنے دام

کھوٹے تو پرکھنے والے کو کیا دوش۔ اپنی مرغی پرائے گھر میں جا کر انڈے دے تو کوئی کیا کرے۔

اتنے میں بچہ کندھا سے لگا لگا کلبلا کر رونے لگا۔

بیوی: اے ہے یہ بچہ کس کا اُٹھالائے۔

مرزا چرمٹی: (کچھ جھینپتے جھینپتے بچے کو تھپکتے ہوئے) تمہارا ہی ہے۔

بیوی: کیا اتنے دن میں ابا بھی بن گئے؟ لڑکا ہے یا لڑکی؟

مرزا چرمٹی: تم ایک جنم کی کڑک ہو تو کیا وہ بھی کڑک ہوتی۔ اور لڑکا ہے میں لڑکی کا باپ کیوں بنتا۔

بیوی: اور یہ تمہیں کیونکر یقین ہے کہ تمہارا ہی ہوگا۔ رنڈیوں کا پیٹ تو اندھی فقیرنی کی جھولی ہوتا ہے۔ خدا جانے کون ٹکڑا ڈال گیا

مرزا چرمٹی: اُفوہ ری عورت۔ تیری زبان کے آگے تو لگام ہی نہیں۔

بیوی: بے لگام تم ہویا میں۔ نہ گرم دیکھا نہ ٹھنڈا کھائی۔ جہاں منہ اُٹھا جا کود ے اور اپنا پرایا جس کا ملا اُٹھالائے۔

مرزا چرمٹی: تمہاری جان کی قسم میرا ہے وہ تو کئی برس سے تائب ہو چکی تھی۔

بیوی: جب ہی تم پر رکھی۔

مرزا چرمٹی: لیکن حرام تو نہیں کیا۔ باقاعدہ قاضی نے نکاح پڑھایا تھا۔

بیوی: ذرا منہ تو کھولو۔ شکل تو دیکھوں تم پر ہے یا ماں پر۔

مرزا چرمٹی: لو گود میں لے کر اچھی طرح دیکھو۔

بیوی: بڑی خوش مزاج تھیں اور اولاد کی بھوکی، سات برس شادی کو ہوئے مگر چوہے کا بچہ تک نہ ہوا۔

بیوی: (بچے کو گود میں لے کر) ہے تو بڑا پیارا پیارا۔ مگر ماں اور خالہ تو لڑکا پیدا ہونے سے کچھ خوش نہیں ہوئی ہوں گی۔

مرزا چر مٹی: یہ کیوں؟

بیوی: رنڈیاں بھینس کی قوم میں سے ہوتی ہیں۔ کٹڑا اُن کے کس کام کا۔ جس طرح بھینسا بوجھ ڈھوتے ڈھوتے ٹھیلے کھینچتے کھینچتے آخر قصائی کے کھونٹے سے بندھتا ہے۔ اسی طرح ان کا بیٹا غریب نکلا تو ماں بہنوں کی پٹاریاں اُٹھائیں۔ کبھی کبھی منجیرے بجالیے۔ ورنہ کام چور نوالے حاضر۔ اڑاؤ کھاؤ۔ جواری شرابی۔ ان کی لڑکیاں لچھمی سمجھی جاتی ہیں۔

مرزا چر مٹی: بیگم۔ واللہ تم بڑی جہاندیدہ نکلیں۔ یہ باتیں تم نے کہاں سنیں۔؟

بیوی: اب تم مجھے بناؤ تو نہیں۔ ان باتوں میں تم نے کون سا نرالا پن دیکھا۔ سب جانتے ہیں۔ ہاں تو اس کا نام کیا رکھا ہے؟

مرزا چر مٹی: خورشید جمال۔ کیوں کیسا رہا۔

بیوی: (ٹھنڈا سانس لے کر) میرے ہاں اگر کوئی لڑکا ہوتا تو میں بھی یہی نام رکھتی۔

مرزا چر مٹی: بویا نہ جوتا۔ اللہ نے دیا پوتا۔ بلا زحمت چاند سا بیٹا مل گیا۔ اب اس کو یوں سمجھو کہ تمہارے ہی پیٹ سے ہوا ہے۔

بیوی: کتنے دن کا ہے ماشاءاللہ

مرزا چر مٹی: آج گیارھواں دن ہے جو چلّہ نہائی تھیں۔

بیوی: کوئی ڈیڑھ مہینے کا سمجھو۔ پھر دودھ کا انتظام کیا

مرزا چر مٹی: اب تک تو بازار سے لاکر پلاتا رہا ہوں۔

بیوی: پھر اب بھی بازار ہی کا پلانا پڑے گا یا کوئی انّا دیکھو (پیٹ دیکھ کر) اے ہے،

پیٹ تو چھاتی ہو رہا ہے کوئی دم میں بلکنے لگے گا۔ لپک کر کہیں سے کچا دودھ تو لاؤ۔ کڑھائی کا نہ ہو اور گائے کا مل جائے تو کیا کہنا ہے۔ مرزا دودھ لائے جیسا اس وقت بازار میں ملا ہوگا بیوی نے بڑے اہتمام سے بچے کو پلایا۔ تھوڑی دیر تک وہ الگ بچے کو لئے بیٹھی رہیں۔ میاں الگ پلنگ پر کمر سیدھی کرنے کو لیٹ گئے۔

بیوی: (بچہ رونے لگا تھا) اے پڑے ہوئے کیا چھت کی کڑیاں گن رہے ہو۔ اٹھو اب اس علامات کو لائے ہو تو اس کے جینے کا کچھ سامان کرو۔

مرزا چڑمٹی: اب تم جانو تمہارا کام۔ مجھ سے کیا واسطہ؟

بیوی: لو اور سنو، اَبا بننے تک کا واسطہ تھا۔

مرزا چڑمٹی: اچھا اب مجھے کیوں ستاتی ہو۔ دو راتیں آنکھوں میں کٹی ہیں ذرا سونے بھی دو گی یا نہیں۔

بیوی: برس دو برس پھولوں کی سیج پر سوئے۔ پھر بھی نیند نہیں بھری۔ چلو کھڑے ہو، باہر نکلو۔ دیکھو کوئی دودھ پلانے والی مل جائے تو لے آؤ۔ بازار کا باسی تازہ، کچا پکا دودھ کب تک پلایا جائے گا۔ جانور بناؤ گے پل بھی گیا تو یاد رکھنا سینگ ہی مارے گا۔

مرزا چڑمٹی: تم نہ چین لو گی نہ لینے دو گی۔ اچھا بابا جاتا ہوں خدا کرے کوئی مل جائے اور دیکھنا تمہارے کنبے میں کوئی ایسی نہیں جو دودھ پلا دے۔

بیوی: یہ خوب کہی۔ دور پار۔ میرے کنبے والیوں پر کیا آفت آئی جو دودھ پلانے کی نوکری کریں، وہ شہزادیاں ہیں یا مال زادیاں۔

مرزا چڑمٹی: تم سے ایک بات کہہ کر بھی گنہگار ہونا پڑتا ہے۔ نیک بخت میں یہ کب کہتا ہوں کہ وہ نوکری کریں۔

بیوی : پھر کوئی پرائے بچّے کو اپنا دودھ کیوں پلائے ؟

مرزا چرمٹی : خدا ترسی بھی کوئی چیز ہے۔ کہہ کر دیکھو شاید کسی کو بے ماں کا بچّہ سمجھ کر ترس آجائے۔

بیوی : خدا نہ کرے بے ماں کا بچّہ کیوں ہونے لگا۔ تم نے اسے میری گود میں ڈالا ہے یا نہیں۔

مرزا چرمٹی : ہاں ڈالا ہے مگر پیٹ میں تو نہیں ڈالا۔

بیوی : یہ بھی سُنا ہے کہ پیٹ کے نکلے سے پالے کی محبت زیادہ ہوتی ہے۔

مرزا چرمٹی : اچھا تو اپنا دودھ پلاؤ۔

بیوی : کیا کہنا ہے۔ اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھو۔ تمہیں تو خدا نے باہر والیوں کے لئے ہی مرد بنایا ہے۔

مرزا چرمٹی : تو کسی شہزادی سے اس کو دودھ نہیں پلواؤ گی۔

بیوی : انہوں نے اگر پوچھا کہ یہ کہاں سے آیا تو کیا جواب دوں۔

مرزا چرمٹی : غرض کہ تم مجھے اُٹھائے بغیر نہ مانو گی۔

مرزا چرمٹی کپڑے پہن کر گھر سے نکلے۔ آس پاس کئی کٹرے تھے جن میں کوئی جلاہے، دھوبی، سقّے وغیرہ رہتے تھے، وہاں جا کر تلاش کیا تو ایک کولن دودھ پلانے کی نوکری کو تیار ہوگئی۔ اسے ساتھ لے آئے۔ بیوی نے کولن کی شکل صورت دیکھی۔ دودھ میں چیونٹا ڈال کر دیکھا پھر بچّے کو اس کی گود میں دیا تو بچّے نے بھی فوراً چھاتی منہ میں لے لی اور چُسر چُسر دودھ پینے لگا۔ چھٹے انا بھی آگئی اور میاں خورشید جمال پروان چڑھنے لگے

مرزا چرمٹی کو اب روپے پیسے کی طرف سے بےفکری حاصل تھی۔ نیلم، پنّا اس قدر چھوڑ کر

مری تھیں کہ اگر سلیقے کے ساتھ پشتوں کھاتے تو کوئی کمی نہ آتی۔ ان دونوں باپ بیٹوں کے سوا ان کا نہ کوئی وارث تھا نہ ان کے مال کا دعویدار۔ پھر جب نہ بچے اور بیوی کی طرف سے بھی اندیشہ نہ رہا تو مرزا چرمٹی نے باقاعدہ نیلم اور پنا کی جائداد مکان اور مال پر قبضہ جمالیا اور رفتہ رفتہ جس کرائے کے مکان میں رہتے تھے اسے چھوڑ کر مستقل طور پر رنڈیوں کی حویلی میں جا رہے۔

مرزا چرمٹی دوسرے شہزادوں کی طرح اڑاؤ کھاؤ نہ تھے۔ ان کی بیوی بھی نری شاہزادی نہ تھیں کہ دن بھر کھانا اور رات بھر گانا بجانا۔ اچھا کھاتے اچھا پہنتے لیکن واہی تباہی نہیں سلیقے کے ساتھ۔ نہ میاں کو کوئی چھورا کہہ سکتا تھا نہ بیوی کو۔ خود شہزادے تھے پورے نہ سہی۔ بیوی تو کھری کھری شہزادی تھیں۔ جتنا چاہتے کھل کھیلتے۔ مال مفت دل بے رحم۔ مگر ان دونوں میاں بیوی کا طریق کچھ اور ہی تھا۔ نہ شہزادوں میں میاں کی زیادہ اٹھک بیٹھک تھی نہ بیوی کی آمد و رفت۔ شادیوں، غموں کے سوا نہ کہیں آتے نہ کہیں جاتے۔ گھر کے چلن میں بھی کوئی فضول خرچی کبھی کسی نے نہیں دیکھی اور سب سے بڑھ کر تو یہ کہ مرزا چرمٹی خود ان پڑھ ہونے کے باوجود عام تعلیم سے خاص دلچسپی رکھتے تھے۔ بیوی سے جب کبھی ذکر آیا کہا کرتے تھے کہ خورشید جمال کو اگر خدا نے مجھے زندہ رکھا تو ولایت تک پڑھنے کے لئے بھیجوں گا۔

چنانچہ پانچویں ہی سال انہوں نے لڑکے کو مدرسے میں بٹھا دیا۔ لڑکا بھی ذہین اور ہونہار تھا۔ ہر برس پاس ہوتا چلا گیا بلکہ بعض جماعتیں تو چھٹے مہینے پھلانگ لیں۔ سولہویں سال بی اے کرنے کے بعد مرزا نے وکالت کے لیے لاہور بھیج دیا۔ لاہور سے وکیل بن کر آیا تو بہت خوشیاں ہوئیں۔ مرزا چرمٹی نے اپنے بھائی بندوں اور دوستوں کو نہایت دھوم دھام کا جلسہ دیا۔ سب کو اچنبھا تھا کہ شہزادہ اور وکیل۔ صورت شکل اچھی تھی۔ وضع قطع بھی معقول۔ مٹھار مٹھار کر باتیں کرتی تو شہزادوں کی مشہور ہیں۔ پھر غالباً پہلی کھیپ کے مسلمان وکیل تھے۔ بہت جلد کام چل پڑا۔

بیٹا جوان ہوگیا اور کمانے بھی لگا۔ اس لئے اب اس کی شادی کی فکر لازمی تھی۔ مرزا چرمٹی کی بیوی اگرچہ سگی ماں نہ تھیں لیکن آخر پالا تو انہی نے تھا۔ وہ خورشید جمال کو دولہا بنا ہوا دیکھنا نہ چاہتیں تو اور کون چاہتا۔ اس لئے ہر دوسرے تیسرے دن جب مرزا چرمٹی سویرے سے گھر میں آجاتے تو یہی سبق رہتا کہ دیکھو لڑکا جوان ہوگیا ہے۔ شادی کردو نہیں تو ہاتھ سے نکل جائے گا۔ میرا کام جتانے کا ہے آگے تم جانو۔

مرزا: یہ تم نے کیا کہا۔ ہاتھ سے نکل جانے کے کیا معنی؟ خدانخواستہ کوئی بات سنی یا دیکھی میں تو اسے ایسا نہیں جانتا؟

بیوی: تم نے آنکھوں پر پٹیاں باندھ لی ہیں۔ دوسرے گھر میں رہتے کب ہو جو کچھ دیکھو

مرزا: اور وہ گھر میں کب رہتا ہے۔ صبح کا گیا گیا شام کو چار پانچ بجے آیا۔ کھانا کھایا اور چلا گیا۔ پھر رات کو کہیں دس گیارہ بجے آتا ہے۔ کیا کوٹھے پر کسی سے آنکھ تو نہیں لڑائی؟

بیوی: اے کوٹھے دوٹھے کی تو تمہیں خبر ہوگی۔ میں تو گھر کی کہتی ہوں۔

مرزا: ارے بی تم تو فاختائیں اڑانے لگیں۔ گھر میں تم نے اس کی کیا بات دیکھی۔ پڑوس بھی ہمارا ایسا نہیں۔

بیوی: گھر میں ماما جو ہے حسن آرا، بہن کی لڑکیاں بھی آتی رہتی ہیں۔

مرزا: لاحول ولا قوۃ! امانی خانم کو کہتی ہے۔ چھ بچوں کی ماں پھر صورت دیکھو تو چڑیلوں کی سی اور گندی اس قدر کہ دور سے بھپکا آتا ہے۔ سچ کہتا ہوں اگر اس نے خورشید کو پالا نہ ہوتا تو میں کبھی اسے گھر میں رہنے نہ دیتا۔ رہیں حسن آرا کی لڑکیاں۔ ان کی اول تو عمریں ہی کیا ہیں زیادہ سے زیادہ آٹھ آٹھ سات سات برس کی ہوں گی دوسرے ان میں ایسی کون سی ادائیں ہیں کہ نور جہاں اور جہانگیر کے سوانگ کا تمہیں ڈر ہوا۔

بیوی: پٹّن تو یہی ہے کہ میاں اس چڑیل پر ریجھے ہوئے ہیں اور جہاں وہ لڑکیاں آئیں برخوردار نے آنکھیں گڑو دیں پھر بے حیائی اس درجے کی کہ میں جانتی ہوں کسی شہدے میں بھی نہ ہوگی۔ میں کھڑی ہوں یا بیٹھی ہوں باتیں مجھ سے کر رہا ہے اور نظریں اُدھر ہیں۔ میں نے کئی مرتبہ ٹوکا بھی کہ خورشید تم نے یہ کیا طرز اختیار کیا ہے۔ میری طرف دیکھ کر بات کرو۔ یہ کیا کہ باتیں مجھ سے کر رہے ہو اور منہ دوسری طرف ہے مگر کیا مقدور جو اس پر ذرا بھی اثر ہوا ہو۔

مرزا سوچ میں پڑ گئے کچھ سمجھ نہیں آیا۔ اس لئے کہ نہ تو وہ خود بدنظرے تھے۔ کبھی گھر کی کسی بہو بیٹی کو بُری نیت سے آنکھ بھر کر نہیں دیکھا تھا۔ نہ بیٹے کی نسبت آج تک کوئی ایسی خبر سنی تھی لیکن بیگم کو جھٹلا بھی نہیں سکتے تھے۔ اس وقت تو چپ ہو رہے، زیادہ بحث کرنی مناسب نہیں سمجھی۔ ہاں نگرانی شروع کر دی کہ جب تک اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیں تدارک کس طرح کیا جائے۔ بیٹے سے کچھ کہیں تو کیا چیز سامنے رکھ کر۔

انہی دنوں ہونی شدنی ایک دوغلے انگریز کا ایک مقدمہ مسٹر خورشید جمال کے پاس آگیا۔ اس انگریز کی ایک اٹھارہ بیس برس کی جوان لڑکی تھی۔ آنکھ ناک سے درست اور چنکو منکو، بہت سے بانکے ترچھوں کی اس پر نگاہیں تھیں۔ اثنائے مقدمہ میں وہ ایک روز کہیں باپ کے ساتھ وکیل صاحب کے بالاخانے پر آگئی۔ میز کے عرض میں ادھر وکیل صاحب بیٹھے تھے، سامنے صاحب بہادر، دائیں طرف مس صاحبہ بیٹھ گئیں۔ مقدمہ کے متعلق گفتگو شروع ہوئی۔ وکیل صاحب برسوں سے ہمیشہ دھنیلے کی عینک لگاتے تھے۔ دُھنیلے کے تال بھی اتنے گہرے ہوتے کہ آنکھیں نظر نہ آتیں۔ عینک اترے ہوئے کبھی انہیں کسی نے دیکھا ہی نہیں۔ نہ گھر میں نہ باہر، نہ رات کو نہ دن کو۔ یہ اندھیری کیوں چڑھائے رہتے ہ؟ کسی نے اس کا خیال نہیں کیا۔ کوئی سمجھتا کہ یہ بھی کہیں کا فیشن ہوگا۔ کوئی سمجھتا کہ شاید آشوب چشم کی بیماری ہے بہرحال اس وقت بھی بدستور عینک چڑھی

ہوئی تھی۔ اب صاحب بہادر وکیل صاحب سے مقدمے کی کارروائی کے متعلق باتیں کر رہے ہیں اور وکیل صاحب کا رُخ لڑکی کی طرف ہے۔ ایک سیکنڈ کے لیے نہیں ہٹتا۔ دو چار مرتبہ صاحب نے کہا بھی "وِل مسٹر خورشید میری طرف متوجہ ہو لیکن اُن کا چہرہ اُدھر ہی رہا۔ آخر جل کر وہ بولا "مسٹر خورشید میں تمہاری یہ غیر شریفانہ حرکت برداشت نہیں کر سکتا۔

خورشید، کیا جناب میں سمجھا نہیں (اور اب بھی منہ لڑکی ہی کی طرف تھا)

صاحب: تمہاری شرافت میں مجھے شک ہو گیا ہے اور اس کا نتیجہ تمہارے لیے اچھا نہیں ہوگا۔

خورشید: یہ آپ کیا فرما رہے ہیں (چہرے کا رُخ بدستور لڑکی کی طرف رہا)

صاحب: شرم شرم۔ میرے سامنے تم مس صاحبہ کو گھورے جاتے ہو۔

خورشید: میں میں۔

صاحب: ہاں۔ تم تم

خورشید: ہرگز نہیں (مگر چہرے کا رُخ اُدھر ہی ہے)

صاحب: یو ڈیم۔ راسکل۔

اور صاحب بہادر گھونسہ تان کر کھڑے ہوئے۔ دو چار سخت الفاظ کی رد و بدل ہونے کے بعد لپاڈگی ہونے لگی۔ مس صاحبہ نے جب تک باپ کو زور دیکھا چُپ کھڑی تماشا دیکھتی رہیں لیکن مسٹر خورشید نے جس وقت اکھیڑ میں بیٹھ کر صاحب کو پٹخنا چاہا تو غل مچا دیا۔ سڑک کے کنارے بالاخانہ تھا شور سن کر کچھ راہگیر کچھ آس پاس کے دکاندار اُوپر چڑھ گئے اور بیچ بچاؤ کرا دیا۔ اس ہشت مشت میں عینک اُتر گئی تھی۔ دیکھتے ہیں تو وکیل صاحب بھینگے (انا للہ و انا الیہ راجعون) صاحب بہادر کی مشکوک نظریں بھی بدل گئیں اور لوگ بھی ہنستے ہوئے اپنی راہ لگے۔ بات آئی گئی ہوئی۔

مسٹر خورشید جمال کو ان کے مدرسے کے یار مرزا آڑے کہا کرتے تھے۔ لیکن چونکہ اسکول کے بعد آٹھ دس برس دلی سے باہر رہے۔ آئے تو عینک لگائے۔ اس لئے کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ بے تکلف دوستوں میں یہ مرزا آڑے کیوں مشہور ہیں۔ شہر والوں میں پھبتیاں کسنے اور نام رکھنے کی خاص عادت ہے۔ ہر شخص یہی سمجھتا کہ ان کی چال دیکھ کر کسی نے مرزا آڑے کہہ دیا۔ یہ جب چلتے جھپ کھاتے پتنگ کی طرح۔ ایک طرف سے دبے اور ایک طرف سے اُبھرے ہوئے۔

خورشید نے انٹرنس عربک سکول سے پاس کیا تھا۔ عربک سکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ خواجہ شہاب الدین۔ اپنی شان اور وضع کے ایک ہی آدمی۔ قد و قامت بھی ایسا تھا کہ جس مجمع میں کھڑے ہوتے یہ معلوم ہوتا کہ گھنٹہ گھر کھڑا ہے۔ گرمی میں سفید، جاڑے میں شالی منڈا سا بندھا ہوا۔ اچکن اور اچکن پر موسم کے لحاظ سے سفید یا سیاہ چغہ۔ گلے میں سموسہ کیا ہوا لٹھے کا سوا گزی رومال جس کی گرہ چھاتی پر ہوتی۔ تنگ موری کا پاجامہ، قصور کی کامدار جوتی۔ دُور سے الگ پہچانے جاتے کہ ماسٹر شہاب الدین ہیں۔ ان کے پڑھانے کا طرز بھی نرالا ہی تھا۔ کتاب تو برائے نام کبھی کھول لی ورنہ سارا گھنٹہ چٹکلوں میں گزرتا لیکن باتوں باتوں میں وہ سبق پڑھا جاتے کہ ان کے مضمون میں کبھی کوئی فیل ہی نہیں ہوا۔ پھبتی بازی میں پورے استاد تھے۔ ان کے نام رکھنے اولڈ بوائز میں اگر کوئی زندہ ہو تو اس سے پوچھئے۔ مرزا خورشید جمال کا نام مرزا آڑے خدا بخشے ماسٹر شہاب الدین ہی نے رکھا تھا۔

اچھا تو یہ پُرانی باتیں تھیں اور چند ایسے دوستوں تک محدود جو دل میں مسٹر خورشید کو سوائے مرزا آڑے کہنے کے اُن کے عیب کو طشت از بام کرنا نہیں چاہتے تھے اس لئے ان کی نگاہ کے زاویوں پر کبھی کسی نے غور نہیں کیا کہ کس ڈگری کی ہیں۔ مرزا چہ مٹی کو بیٹے کا بھینگا پن کیوں نہ معلوم ہوگا کہیں ایسا ہو سکتا ہے کہ جس نے پال کر بڑا کیا ہے وہ نہ جانتی ہو لیکن قدرتی عیب تھا پرواہ نہ کی۔ سمجھے

ہوں گے کہ نگاہ ٹھہرنے لگے گی۔ بڑا ہو جائے گا تو جس طرح اور بہت سے عیب اور نقص وزرزش احتیاط اور بناوٹ سے چھپا دیئے جاتے ہیں۔ آنکھیں بھی شاید درست ہو جائیں۔ اس کے بعد جب کالج میں یہ عیب نمایاں ہونے لگا اور مرزا پر دوسرا عالم طاری ہوا تو انہوں نے عینک لگانی شروع کر دی۔ عینک نے بظاہر عیب پر پردہ ڈال دیا۔ پردہ پڑتے ہی باہر والے تو باہر والے گھر والے بھی ایسے بھولے کہ بجائے آنکھوں کے دوسرے عیب لگانے لگے۔

بہر حال جس دن وکیل صاحب کی صاحب بہادر سے گلخپ ہوئی ہے، دو چار ملنے والوں نے مرزا چرمٹی کے گھر جا کر واقعہ بیان کر دیا۔ اتفاق کی بات مرزا چرمٹی مکان پر موجود نہ تھے۔ کہنے والوں نے ماما کے ہاتھ بیگم صاحبہ کو کہلا بھیجا کہ "آج ایسا معاملہ ہوا ہے۔ صاحب عالم سے عرض کر دیں کہ پولیس کچہری میں خبر رکھیں ایسا نہ ہو کہ وہ انگریز بچہ کوئی فیل لے آئے" غلطی سے اب بھی کسی نے یہ نہیں کہا کہ اصل بات کیا تھی؟ بنیاد فساد آنکھوں کا عیب تھا کہ نیت کی خرابی۔

یہ سن کر بیگم بیچاری کو ادھر تو ہول پر ہول آنے لگے۔ اُدھر خورشید کی نسبت پختہ یقین ہو گیا کہ اس کے طور خراب ہو گئے۔

بیچاری گھر کی بیٹھنے والی شہزادی، پالا ہوا بچہ اور اس کے یہ ڈھنگ، رہے سہے اوسان جاتے رہے کہ رام جی نے بیٹا دیا وہ بھی مسلمان کا لیکن عورت تھی حوصلے کی منہ سے بھاپ نہ نکالی گھر کی پرانی ماما نے پوچھا کہ "بیگم! شیخ جی یہ کیا کہہ گئے۔ دور پار چھوٹے صاحب عالم پر کیا کوئی مقدمہ لگ گیا؟ تو یہ کہہ کر اس کی زبان بند کر دی کہ تو! خدا نہ کرے ایسی بری فال تو منہ سے نہ نکالو، وکیلوں کے پاس ایسے قصے روز آتے ہیں۔ موکل آپس میں لڑ پڑے ہوں گے۔ ہمسایوں کو بھی اسی طرح کچھ کہہ کر ٹال دیا لیکن دل ہوائی تھا۔

اس دن مرزا چرمٹی رات کو کسی قدر دیر سے آئے انہیں وکیل صاحب کے کوٹھے کا واقعہ

مفصّل معلوم ہوگیا تھا یعنی یہ کہ صاحبزادے کی آنکھوں کے نقص اور اسے چھپانے کی غرض سے اندھیری عینک لگانے کا سارا فتور اور اب ان پر بیوی کی بدگمانی کی حقیقت بھی کھل گئی کہ ایک سے بات کرنا اور دوسری طرف دیکھنا لیکن بُری نیت سے نہیں بلکہ قدرت نے اس کی نظر کا زاویہ ہی ایسا بنایا ہے۔

غرض کہ مرزا چرمٹی صاحب گھر میں آئے تو اُن کے دل و دماغ پر بیٹے کی طرف سے کوئی بوجھ نہیں تھا۔

مرزا: (بیوی سے) آج چپ چاپ کیسی پڑی ہو؟

بیوی: چُپ نہ پڑوں تو کیا گاؤں بجاؤں۔

مرزا: کیا ڈر ہے تمہارے کنبے میں کیا ایسا نہیں ہوتا۔

بیوی: ہوتا ہوگا تمہارے کنبے میں۔ گانے بجانے والوں کا کنبہ تو تم چھوڑ چکے ہو۔ گانا بجانا یاد آرہا ہے تو خیر ان باتوں سے کیا کام۔

مرزا: کھانا دو گی یا نہیں؟

بیوی: کھالو۔ میں تو نوالے بنا کر دینے سے رہی۔

مرزا: اللہ رے بوڑھی گھوڑی تیری تر بھر۔

بیوی: مجھے یہ باتیں اچھی نہیں لگتیں (کروٹ لے کر) بکے جاؤ میں تو سوتی ہوں۔

مرزا: اور میں سونے کب دیتا ہوں۔

بیوی: دیکھو مرزا میں کچھ کہہ بیٹھوں گی تو پتنگے لگ جائیں گے۔

مرزا: اچھا بابا نہ اٹھو میں خود کھا لوں گا۔

مرزا کھانا کھاتے رہے اور بیوی پلنگ پر پڑی پڑی ٹھنڈے سانس لیتی رہی۔

مرزا: (ہاتھ دھوتے ہوئے) ماما کہاں گئی۔

بیوی: جائے گی کہاں سوگئی ہوگی۔ اب تمہارے لیے آدھی رات تک بیٹھی رہنے سے تو رہی۔ کیوں اس کا کیا اچار ڈالو گے؟

مرزا: امچور کا کہیں اچار پڑا کرتا ہے۔ ذرا حقّہ بھروانا۔

بیوی: آپ کیوں نہیں بھر لیتے؟ آگ چولھے میں دبی ہوئی ہے۔

مرزا: پانی پھینکنا، تازہ کرنا، چلم میں تمباکو رکھنا۔ یہ بھی تو کام ہیں۔

بیوی: اللہ اللہ کیوں نہیں بھلا اس سے زیادہ مشکل کام اور کون سا ہوگا۔ میاں مٹھو سا اٹھ کر دیکھا تو ہوتا حقّہ تیار رکھا ہے۔ فقط آگ کی کسر ہے۔

مرزا: شاباش بھئی کسی نے سچ کہا ہے کہ بڑھاپے میں بیوی ماں۔۔۔

بیوی: اے بس۔ زیادہ للّو نہ چلاؤ۔ تمہارے منہ میں بواسیر ہے۔ کچھ اور نکل گیا تو مشکل پڑ جائیگی

مرزا: ہاں بیگم سچ کہتی ہو۔ اچھا تو میں چلم پر آگ رکھ لاؤں۔ ابھی سونا نہیں۔ آج تم سے اٹکن بٹکن کھیلنی ہے۔

بیوی: یہ نہیں کہتے کہ گڑیاں کھیلوں گا۔ اے پھٹّے سے منہ۔ خیر تم چلم بھر لاؤ۔ مجھے تم سے ایک بات کا فیصلہ کرنا ہے۔ ذرا پاندان اٹھا کر دیتے جاؤ۔

مرزا: میرے لئے تو پان بنانے کی ضرورت ہے نہیں۔ ڈبیا میں ابھی کئی پان باقی ہیں۔

بیوی: تمہیں بنا کر دے میری جوتی خود کھاؤں گی بڑی دیر سے جماہیاں پر جماہیاں آرہی ہیں

مرزا: کیوں صاحب! یہ بات، جوانی میں تو منہ میں گلوریاں ٹھونسی جاتی تھیں۔ بڑھاپے میں جوتی خور بناتی ہو۔ مرزا یہ کہتے اور ہنستے چلم اٹھا باورچی خانے میں پہنچے۔ چلم بھری، حقّے کا پانی دیکھا اور گڑگڑاتے ہوئے گاؤ تکیے سے لگ کر آبیٹھے۔

بیوی : آگ تو خاصی نکل آئی ہوگی ؟

مرزا : آگ تو کیا خاک ہاں چنگاریاں نکل آئیں ۔خیر میں نے کچے کوئلے رکھ لئے ہیں سلگ ہی جائے گا تم کچھ فکر نہ کرو ۔

بیوی : (پان کی پیک تھوک کر) میں تم سے ایک بات پوچھتی ہوں خورشید مرزا تو سوتیلا سہی سوکن کا بچہ ۔تمہارا تو سگا ہے ۔تم اس کی طرف سے اتنے غافل کیوں ہو ۔شادی کیے بھی دن ہیں کیوں نہیں کر دیتے ۔

مرزا : تمہارا ہاتھ کس نے پکڑا ہے اس کی دلہن لانے کی مجھ سے زیادہ تو تمہیں خوشی ہوگی ۔

بیوی : اوئی تو کیا کہیں سے پکڑ لاؤں ۔

مرزا : تو مجھے بتا دو لڑکیاں کہاں بکتی ہیں ۔میں خرید کر لا دوں

بیوی : کیسا مردوا ہے سیدھی بات ہی نہیں کرتا ۔

مرزا : اچھا تو آپ فرمائیے ۔

بیوی : رقعے لکھو ۔مشاطائیں لگاؤ ۔دوستوں سے ذکر کرو ۔آخر دنیا میں شادی بیاہ ہو رہے ہیں یا نہیں ۔

مرزا : ہو تو رہے ہیں مگر کیا بیٹے کی دلہن ڈھونڈنا باپ کا کام ہے ۔

بیوی : ہاں ہاں میں جانتی ہوں کہ مائیں کرتی ہیں لیکن باپ کو بھی تو کچھ تگ و دو ہونی چاہیئے ۔یہ کیا کہ سانڈ بنا کے چھوڑ دیا ۔

مرزا : مجھ ہی کو الزام دیئے جاؤ گی ۔

بیوی : اے لو اور کسے الزام دوں ۔ماشاءاللہ بائیس بھر کر تئیس میں لگا ہے ۔تم نے ایک

دن بھی اس کی جوانی کو رینگ لگنے کی فکر کی؟

بیوی: پھر وہی مرغی کی ایک ٹانگ۔

مرزا: (تالی بجا کر) ایک نہیں دیکھ لو دو نوں ہیں۔

بیوی: اب جو اپنے اوپر تھپنے لگی تو مذاق میں اڑانے لگے۔ اچھا چلو جانے دو میری جوتی کی نوک سے، صاحبزادے صاحب کو بٹھے پھلانگیں یا گھر گھالیں ناک کٹے گی تمہاری۔ میں تو یہ کہہ کر الگ ہو جاؤں گی کہ جیسا پیٹ ویسا انگیٹھ۔ گندی بوٹی کا پاک شوربہ تو ہونے سے رہا۔

مرزا: اچھا تو پھر کیا کہتی ہو؟

بیوی: لو اور سنو ساری زلیخا پڑھ گئے اور پوچھتے ہیں مرد تھی یا عورت۔ مردوئے مجھے یہ چند رانا اچھا نہیں لگتا۔

مرزا: تمہارا مطلب یہی ہے نا کہ خورشید کی شادی کر دینی چاہئے۔

بیوی: خدا نہ کرے میں تو چاہتی کہ وہ روز تمہاری ناک کٹوائے

مرزا: نیک بخت تو میں کب کہتا ہوں کہ تم اس کی شادی نہ کرو۔ جہاں چاہے رقعے بھیجو جتنی چاہے مشاطائیں لگاؤ۔

بیوی: اور تم منہ چھپائے بیٹھے رہو۔

مرزا: اب میں تم سے کیا کہوں۔ میں نے تو اپنی سی کوشش کر لی۔

بیوی: اس کا کیا مطلب؟ ہم میں کوئی کمی ہے؟

مرزا: ہم میں جو کوئی فی نکالے تو اُس کے سات جنم میں فی۔

بیوی: پھر لڑکے میں عیب نکالتے ہیں؟

مرزا: ابھی تک کسی نے نکالے تو نہیں مگر۔

بیوی : اگر مگر تو میں جانتی نہیں۔ بہت بہت کہہ سکتے ہیں کہ اس کی ماں رنڈی تھی، ہاں تھی، قلعہ والوں میں اس کا عیب کس نے گنا ہے۔ باپ بادشاہ یا بادشاہ زادہ ہونا چاہئے بڑے حضرت کون سے بیگم کے پیٹ سے تھے۔ وہی مثل ہے پہلی تھی مہترانی راجہ کے گھر آ کر بن گئی رانی۔

مرزا : نہیں اس کو تو ویسے بھی آج کل کوئی عیب نہیں گنتا۔

بیوی : یہ نہیں کہ لڑکا پڑھا لکھا نہیں نکما ہے۔ شہزادوں میں ہیرا سمجھنا چاہئے۔ وکیل ہے اور کیا ہوگا۔ بادشاہت کا تخت تو اب ملنے سے رہا۔

مرزا : ارے بی کیا کہوں اللہ میاں نے عیبی کر دیا ہے۔

بیوی : خدانخواستہ دور پار اس کے دشمن عیبی ہوں۔ لنگڑا ہے ٹنجا ہے۔ تم نے کون سا عیب دیکھا ؟

مرزا : تمہاری غلطی کا نتیجہ — کوڑی لٹکا دیتیں تو کچھ نہ کچھ عیب نکل ہی جاتا۔

بیوی : کوڑی لٹکانا کیسا ؟

مرزا : تم کو نہیں معلوم ؟

بیوی : میں کیا جانوں۔ میں نے تو کوڑی لٹکانے کا مسئلہ آج ہی سنا ہے۔

مرزا : واہ واہ بارہ برس دلّی میں رہیں اور بھاڑ ہی جھونکا۔

بیوی : توبہ ہے ایسا جھکّی مردوا بھی خدا کرے کسی کا خصم ہو۔

مرزا : اچھا۔ تم نے کوٹھے کا قصّہ تو سنا ہوگا۔

بیوی : ہاں سنا ہے پھر شادی نہ کرو گے تو یہی ہوگا۔

مرزا : نہیں یہ معاملہ نہیں تھا۔

بیوی : پھر ؟

مرزا: تم نے کیا شکایت کی تھی؟ یہی نا وہ تم سے بات کرتا ہے نگاہ رہتی ہے ماما کی طرف

بیوی: یہ تو وہی بد چلنی کا عیب ہوا جس کا رونا میں مہینوں سے رو رہی ہوں۔

مرزا: تم بھی دھوکے میں رہیں اور میں بھی۔ بات دراصل یہ ہے کہ تم نے بچپن میں کوڑی نہیں لٹکائی

بیوی: اے چلو ہٹو کوڑی کوڑی لٹکانا کیا؟

مرزا: نیک بخت کچھ بسنت کی بھی خبر ہے۔ تمہارے لاڈلے کی آنکھیں ترچھی ہیں۔ اگر تم بچپن میں خیال کر لیتیں اور دوسری طرف آنکھ کے پاس کوڑی لٹکا دیتیں تو کبھی نکل جاتی۔

بیوی: (ماتھا پکڑ کر) افوہ! میں تو بالکل ہی بھول گئی۔ میاں خورشید بھینگے ہیں۔ انہوں نے عینک ہی ایسی چڑھائی ہے کہ مجھے کبھی اس بات کا دھیان ہی نہیں آیا۔ اچھا تو سب یہ آنکھوں کا فتور ہے۔

مرزا: اور کیا

بیوی: لیکن اب اس کا کیا علاج۔ خدا نے جیسا بنا دیا۔ دنیا میں بڑے بڑے عیب داروں کو بیٹیاں مل جاتی ہیں۔

مرزا: مگر ان کے عیب کھلے ہوئے ہوتے ہیں

بیوی: پھر اپنے بیٹے سے بھی کہہ دو کہ عینک اتار ڈالو۔ اس کا عیب بھی کھل جائے گا۔

مرزا: چاند سی صورت کو گہن لگاتی ہو۔

بیوی: اوئی مردوئے کسی طرح چین بھی ہے شادی نہیں کرنی تو دیسی کہہ دو۔ ہرائی جتائی سے کیا فائدہ۔

مرزا: بیگم تمہارا مزاج بڑھاپے نے خراب کر دیا ہے۔ بگڑی جاتی ہو بگڑی جاتی ہو نیک بخت

میں نے اس کے کئی دوستوں سے کہلوایا ہے۔ وہ نہیں مانتا کہتا ہے کہ کچہری عدالت میں ججوں مجسٹریٹوں کے سامنے میرا مذاق اڑواؤ گے۔ بھینگا وکیل مشہور ہو جاؤں گا۔

بیوی: کچھ سوچ کر کہتا تو ہاں ہے صحیح ہے۔ اچھا پھر؟ میری جان بڑی غضب میں آئی۔ ساری عمر میں ایک بیٹا بنایا اس سے بھی ارمان نکلنے نصیب نہیں

مرزا: میں بھی اسی سوچ میں ہوں۔ دیکھو اللہ مالک ہے۔ کل بختیار شاہ کے ہاں پیغام بھیج رہا ہوں۔ دعا کرو کہ کوئی فی نہ نکلے۔

بیوی: بختیار شاہ کا گھر تو خوب تاکا۔ لڑکی بھی ہمارے خورشید کی جوڑ ہے مگر سنتی ہوں کہ ان کے نخرے بہت ہیں۔ لڑکی نے پڑھ لکھ کیا لیا ہے کہ اس کی چار آنکھیں ہو گئی ہیں۔ اللہ پناہ دے اگر کہیں شادی کے بعد بھید کھلا تو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

مرزا: تو کیا؟ میں کہتا ہوں کہ بھید پہلے سے کھل جائے تو اچھا ہے۔

بیوی: تمہاری سمجھ کہاں گئی۔ یہ معلوم ہو گیا کہ لڑکا بھینگا ہے تو بختیار شاہ بیٹی دیں گے اور کسی طرح وہ راضی ہو بھی گئے تو لڑکی مانے گی؟

مرزا: لیکن بھید چھپانے میں یہ مصیبت ہے کہ جس طرح تم نے اس کو بد نظر کہہ دیا اسی طرح وہاں بھی بدنیت مشہور ہو جائے گا اور جوتیوں میں دال بٹے گی۔ ان کے ہاں ماشاء اللہ اول تو کئی جوان جوان لونڈیاں ہیں پھر مہمانوں کا روز تانتا بندھا رہتا ہے۔ تمہارا بیٹا بات کسی سے کرے گا رُخ دوسری طرف ہوگا۔ دیکھنے والے کیا سمجھیں گے اور بیوی کا دل کیا کہے گا۔

بیوی: میاں خورشید اب بچے تو رہے نہیں۔ بیوی کو بدظن دیکھ کر خود کہہ دیں گے۔ موزے کا گھاڈ رانی جانے یا راؤ۔ میاں بیوی میں کوئی عیب چھپا نہیں رہتا اب تم اس کا زیادہ وہم نہ کرو۔ اللہ کا نام لے کر پیام بھیج دو۔

مرزا: بھئی میں بھی سوچتا ہوں اور اسی لئے مرزا کلو کو بلایا ہے ان کے ذریعے سے سلسلہ جُنبانی کا ارادہ ہے۔

بیوی: مرزا کلو آدمی تو کانٹے کے ہیں۔ اللہ نے چاہا تو سوکھا جواب لے کر نہیں آئیں گے۔

خورشید جمال شہزادوں میں ہر صورت سے ہیرا تھے۔ ہر بیٹی والے کی آنکھیں ان کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ پندرھواڑے کے اندر اندر ہتھیلی پر سرسوں جم گئی۔ بختیار شاہ نے معمولی گفتگو کے بعد ہاں کر لی۔ اور دونوں طرف تیاری ہونے لگی۔ اِدھر بھی جلدی تھی اور اُدھر بھی عجلت۔ اگلا مہینہ عید کا تھا۔ چاند رات نکاح ہو گیا۔ بختیار شاہ کی اکلوتی بیٹی زہرہ سلطان مرزا آرٹے کی بیوی اور مرزا چرمٹی کی بہو بن کر آ گئیں۔ دولہا میاں دلہن سے خوش تھے اور دلہن دولہا کو دیکھ کر نہال نہال۔ وہ محبت وہ پیار کہ لوگ ان کے سہاگ کی قسم کھانے لگے پہلا مہینہ تو دلہن کا گھونگھٹ میں گزرا۔ دوسرا مہینہ تھا کہ یکایک ساس کی طبیعت بگڑ گئی۔ دو چار دن تو کچھ خیال نہیں ہوا۔ ماماؤں نے جیسا چاہا پکایا رِیندھا سب نے صبر شکر کر کے کھا پی لیا یہ جانتے تھے کہ معمولی بخار ہے جاتا رہے گا۔ آج نہیں تو کل چولھے کی تقدیر کھُل جائے گی۔ لیکن اِدھر تو ان کی بیماری نے طُول کھینچا اُدھر کھانا ایسا بدمزہ پکنے لگا کہ ایک وقت تو کوئی زبان پر بھی نہ رکھ سکا۔ شہزادوں کی زبان بگڑی ہوئی۔ ڈھب ڈھب شوربہ بساندا گوشت۔ اُبالی ترکاری ان کے حلق سے کیا اُترتی۔ علاوہ اس کے ماماؤں نے کوٹنا شروع کر دیا۔ مریضہ کے کانوں تک جب یہ باتیں پہنچیں تو انہوں نے بہو کو بلا کر کہا۔ بیٹی اوّل تو میں پکّا پان ہوں نہ جانے کب آنکھ بند ہو جائے۔ دوسرے تم دیکھ رہی ہو کہ بخار نے مجھ کو بالکل نچوڑ لیا ہے۔ اگر جیتی بچ بھی گئی تو دنوں اس قابل نہیں ہوں گی کہ چولھے

میں جا کر جھکوں۔ بُوا اب شرم کس کی۔ اپنے گھر میں گھونگھٹ کے کیا معنی؟ ماماؤں نے ٹُٹس مچا دی ہے اور ٹُٹس مچائیں تو مچائیں کھانے والوں کو پیٹ بھر کر روٹی تو مل جائے۔ آج چوتھا دن ہے۔ میرے منہ میں کھیل کا دانہ نہیں پڑا۔ قلیہ پک کر آیا تو بسانده اور بد مزہ کہ کُتّا بھی نہ کھائے۔ کھچڑی آئی تو دال الگ چاول الگ۔ اُبالی صورت دیکھ کر اُبکائی آنے لگتی ہے۔ راج دلاری میری مانو تو گھونگھٹ اُٹھا دو اور اپنے گھر کو سنبھالو۔ آخر کب تک بازار سے منگا منگا کر کھایا جائے گا۔

دلہن پہلے ہی پھیکا سیٹھا کھاتے کھاتے اُکتا گئی تھیں اور گھر کا مختار بننا کس کو بُرا معلوم ہوتا ہے۔ دوپہر کو یہ باتیں ہوئی تھیں تیسرے پہر ہی سے باورچی خانے میں جا کھڑی ہوئیں۔ دلہن کا میکہ ساری قوم میں کھانے کا شوقین مشہور تھا۔ رات کو دستر خوان بچھا تو بات ہی اور تھی۔ جس نے کھایا اس نے تعریف کی۔ ساس کے سامنے سینی گئی تو اس میں کھچڑی بھی تھی قلیہ بھی اور ساگودانہ، گیہوں کا دلیا بھی کہ جس چیز پر رغبت آئے کھائیں۔ ساس خوش ہو گئیں۔ دو دو نوالے سب میں سے کھائے۔ لاکھوں دعائیں دیں۔ مرزا چرمٹی نے بھی اطمینان کا سانس لیا۔ کوئی دس دن کے بعد نیت بھر کر کھانا نصیب ہوا تھا۔ رات کو مرزا آڑے آئے لَق لَق کرتے ہوئے۔ دلہن کو دیکھا تو دالان میں پتیلیاں انگیٹھیوں پر رکھے بیٹھی ہیں۔ ساتھ ہی لونڈی پاس بیٹھی ہے۔

مرزا آڑے : دونوں مامائیں کیا چلی گئیں جو آپ پکا والے بیٹھی ہیں۔

دلہن : ابھی سے کیوں جانے لگیں۔ باورچی خانے میں ہیں

مرزا آڑے : آج تو خوشبو اچھی آ رہی ہے کیا کہیں سے دعوت آ گئی

دلہن : دعوت کہاں سے آئے گی۔ گھر ہی کے چولھے پہ پکا ہے۔

مرزا آڑے : تو بس میں کھا چکا۔ اماں جان کیسی ہیں ؟

دُلہن : اللہ کا شکر ہے۔ بخار تو آج نہیں ہوا۔

مرزا آڑے : ذرا اُن کے پاس ہو آؤں۔

دُلہن : ان کی ابھی ذرا آنکھ لگی ہے کھانا کھا کر پُوچھ آنا۔

مرزا آڑے : بھوک کے مارے تو آنتیں قل ھُواللہ پڑھ رہی ہیں .... مگر ....

دلہن نے کھانا نکالنا شروع کیا۔

مرزا آڑے : (کھانے کی طرف دیکھ کر) کھانا تو خوب رونق دار ہے۔ سچ بتاؤ کہاں سے آیا ؟

دُلہن : کہہ رہی ہوں کہ گھر ہی میں پکا ہے۔

مرزا آڑے : ہرگز نہیں۔ آٹھ دن سے تو کُتّے کا راتب پک رہا تھا آج کون سے فرشتے آکر پکا گئے۔

دلہن : ایک فرشتہ آگیا تھا۔

مرزا آڑے : اور وہ فرشتہ پکا کر چلا گیا۔

دُلہن : چلا کہاں جائے گا۔ اللہ نے اس کو آپ کی ماما بنا دیا ہے

مرزا آڑے : (ایک لقمہ منہ میں رکھ کر) سبحان اللہ۔ پکانے والے کے ہاتھ چوم لے۔ سچ بتاؤ کس نے پکایا ہے

لونڈی : دولھا میاں پکائے گا کون ؟ آپ کی دُلہن نے پکایا ہے۔

اب تک مرزا آڑے مخاطب دلہن سے تھے اور چہرہ لونڈی کی طرف تھا۔ لونڈی جو بولی تو رُخ بیگم کی طرف ہو گیا اور دیکھنے لگے اُس کو۔

مرزا آڑے: واقعی؟ (پھر رُخ بدل کر) آپ کو میری جان کی قسم۔ اچھا تو کیا گھونگھٹ اُٹھا دیا۔

دُلہن: اماں جان کے حکم کی تعمیل نہ کرتی!

مرزا آڑے: شکر ہے کہ آپ نے اتنا تو خیال کیا۔ گھونگھٹ اُٹھ گیا۔ چلو روٹی تو پیٹ بھر کر ملے گی۔

دلہن: مگر میں پوچھتی ہوں کہ آپ کی اندھیری کب اُترے گی۔

مرزا آڑے: ہر چیز مزے کی ہے۔ میں آپ کو کھانے پکانے میں ایسا ماہر نہیں سمجھتا تھا۔

دلہن: میری بات کا تو جواب دو۔

مرزا آڑے: آپ میری عینک کے کیوں پیچھے پڑی ہیں؟

دلہن: جی گھبرا گیا کسی وقت تو اُترے۔

مرزا آڑے: آپ کا کیا حرج ہے۔ میرا تو جی نہیں گھبراتا۔

دُلہن: آخر میں پوچھتی ہوں کہ کوئی خدا کا حکم ہے کہ رات دن عینک چڑھائے رہو۔

مرزا آڑے: اور میں پوچھتا ہوں کوئی رسول کا فرمان ہے کہ آپ کسی کی راحت میں خلل ڈالیں۔

دلہن: لیکن کچھ معلوم تو ہو کہ آپ آنکھیں کیوں نہیں کھولتے؟ اور عینک لگائی ہے تو نگوڑی کالی بھٹ۔ کبھی تو آنکھوں کو ہوا لگنے دو۔

مرزا آڑے: (ہنس کر) ہوا لگنی کچھ اچھی ہوتی ہے۔ لوگ تو ہوا لگنے کو عیب سمجھتے ہیں۔

دُلہن : اب آپ تو ضلع جگت پر اُتر آئے ۔

مرزا آڑے : اور آپ میری آنکھوں کی ناک پر جہاں بیٹھی تھیں وہیں بیٹھی رہ گئیں۔

دُلہن : لیکن آپ عینک نہیں اُتاریں گے

مرزا : آپ پر کیا بوجھ ہے ؟

دُلہن : بوجھ خدا نہ کرے کیا ہوتا۔ میرا گھونگھٹ اُٹھا تھا آپ کی اندھیری بھی اُتر جاتی۔

مرزا آڑے : آپ کی ضد بھی نرالی ہے ۔

دلہن : ضد کی اس میں کیا بات ۔ دنیا کا قاعدہ ہے کہ گھر میں سارے پردے اُٹھ جاتے ہیں۔ آنکھوں سے آنکھیں ملا کر باتیں کرنے میں جو لطف آتا ہے وہ آنکھیں چھپا کر بات کرنے میں کہاں۔ جو باتیں زبان نہیں کر سکتی وہ آنکھیں کرتی ہیں اور آپ ہیں کہ آنکھوں کا پردہ ہی نہیں اٹھاتے۔ میں جانے دیتی ہوں اب تک تو میں گھونگھٹ میں تھی آپ کی عینک کو گوارا کیا لیکن اب آپ یا اندھیری اُتار دیں یا مجھ سے کہئے میں بھی جب آپ کے سامنے آؤں گھونگھٹ لٹکا کر۔

مرزا آڑے : اچھا بابا اچھا (مُسکرا کر) دیکھو میں سوچوں گا۔

دلہن : اچھی طرح سوچ لو۔ میں نے کہہ دیا ہے اگر رات بے رات تمہاری عینک غائب ہو جائے تو گلہ نہ کرنا۔

مرزا آڑے دل میں بہت پریشان ہوئے لیکن بیوی کی ضد بھی بیجا نہ تھی۔ دیکھنے والے گھبرا اُٹھتے تھے۔ بیوی کو آخر کیوں اُلجھن نہ ہوتی۔ ہنسی کا لُطف آتا نہ بات چیت۔ اب انہیں فکر ہوا کہ عینک کو بچانے کی کیا تدبیر کریں۔ وہی مثل کہ دریا میں رہنا اور مگرمچھ سے بیر۔ سویا مویا برابر ہوتا ہے اگر سچ مچ بیوی اپنی ضد پر آ گئی تو واقعی عینک کہیں کی کہیں

ہو گی اور صبح ہوتے ہی سارا راز فاش ہو جائے گا۔ پھر اس کے بعد اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ کیا ہو۔

اِدھر مرزا آڑے اپنی سوچ میں تھے اُدھر دُلہن دن بھر کی تھکی ہاری ایسی پڑیں کہ فجر کی نماز بھی قضا ہو گئی اور پھر گھر کے دھندوں میں جا لگیں۔ ناشتہ تیار کرانا تھا۔ ساس کی خبر گیری الگ۔ رات کو عینک کے متعلق کیا باتیں ہوئی تھیں۔ سب بھول بھال گئیں میاں دیکھتے رہے کہ شاید پھر عینک یاد آ جائے۔ لیکن جب عینک کا ذکر تک نہ آیا۔ ایک ہفتہ مرزا آڑے کی جان سولی پر رہی۔ گھر آئے تو دبے پاؤں چوروں کی طرح ڈرتے ہوئے اور جب تک رہتے بیوی کی طرف نگاہیں رہتیں کہ کہیں پھر عینک کا جھگڑا نہ شروع ہو جائے۔ لیکن خانہ داری کی اُلجھنیں ایسی کہاں ہوتی ہیں کہ آدمی کسی دوسری طرف توجہ کر سکے۔ ساس نے کھانے پکانے کی ذمہ داری دے کر دلہن پنے کے سارے نخرے ختم کر دیئے تھے۔ بقول کسی کے نون تیل لکڑی کے سوا اور کوئی ذکر رہا تھا نہ فکر لیکن ہونی شدنی۔ وہ جو کہتے ہیں کہ بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔ پکانے والی بڑھیا شامت کی ماری کہیں اپنی نواسی کو ساتھ لے آئی۔ میاں کو جو کالی عینک لگائے دیکھا تو نئی چیز نظر آئی۔ کھڑی ہوئی بھی تو اتفاق سے اس رُخ جدھر بیوی کی طرف دیکھتے وقت مرزا آڑے کا چہرہ ہونا چاہیئے۔

دلہن کی نظروں نے دولہا میاں کا یہ انداز کئی دفعہ دیکھا تھا لیکن بدگمانی کی کوئی وجہ نہ تھی۔ اس لئے کہ گھر میں دو مامائیں تھیں اور دونوں بڑھیا میلی کچیلی کچھ خیال نہیں ہوا۔ لیکن یہ لڑکی اوّل تو بارہ تیرہ برس کی خاصی جوان پھر آئی بھی بن سنور کر۔ اندر ہی اندر رکھوال اُٹھیں نوالہ ہاتھ کا ہاتھ میں رہ گیا۔ میاں کو اس وقت کچھ کہہ نہ سکیں۔ لڑکی سے بھبک کر بولیں۔

"اری وہاں کیوں کھڑی ہے۔ نظر لگائے گی۔ جا اپنی نانی کے پاس"۔

مرزا آڑے: میں تو ڈر گیا

دُلہن: ڈرتے تو اچھے ہی دن نہ ہوتے۔

مرزا آڑے کو دفتر جانے کے لئے دیر ہو رہی تھی۔ زیادہ باتیں کرنے کا موقع نہ تھا ہنستے ہوئے ہاتھ دھو دفتر چلے گئے۔ کچھ نہ سمجھے کہ دفعتہً دلہن کا یہ رنگ کیوں بدلا اور ایسی اُکھڑی اُکھڑی باتیں کیوں کرنے لگیں۔ شہزادوں میں جہاں زیادہ پیار ہوتا ہے ایسی چتم چوٹ ہوا ہی کرتی ہے اور یہ میاں بیوی کا چونچلا سمجھا جاتا ہے۔ اس لئے خیال بھی کرتے تو کیا؛ آپس میں جیسا ہونا چاہیئے سہاگ تھا کوئی نئی بات نہ تھی کہ کچھ شبہ کیا جاتا۔ پھر کچہری کا انہماک۔ مقدمے والوں کی بھن بھن۔ اگر شک ہوا بھی ہوگا تو بھول گئے۔

لیکن دلہن کے دل میں ایک جلن سی پیدا ہوگئی۔ ماما کی نواسی کو تو کھڑے کھڑے رخصت کیا اور خود اٹوائی کھٹوائی لے کر پڑ گیئں۔ ساس اب اچھی ہوگئی تھیں۔ انہوں نے جو سنا کہ دلہن اپنے کمرے میں جا لیٹی ہیں تو ماتھا ٹھنکا کہ کہیں بیٹے کی آنکھوں کا بھید تو نہیں کھل گیا۔ دوڑی ہوئی دلہن کے پاس پہنچیں۔ ماتھے پر ہاتھ رکھا تو ٹھنڈا پھیکا تھا۔

ساس: دلہن جی کیسا ہے؟

دلہن: اچھی ہوں۔ ذرا سر میں درد سا معلوم ہوتا ہے۔

ساس: بٹیا آج تم باورچی خانے میں جم ہی جم جانا۔ ہنڈیاں میں بگھوا دوں گی۔

دلہن: جی نہیں۔ آپ تکلیف نہ کریں۔ ابھی آپ میں اتنی طاقت کہاں کہ چولھے میں جا کر جھکیں۔

ساس: خیر۔ کوئی اور بات تو نہیں۔

دلہن: جی نہیں۔ اور خدانخواستہ کیا بات ہوگی۔

ساس: بھئی میں تو بھول گئی۔ بڑھیا شفقن نے کچھ اس طرح جاکر کہا کہ مجھے بیسیوں وہم آنے لگے اور بیٹا وہ جو ماما کی نواسی آئی تھی وہ کہاں گئی۔

دلہن: جی ہاں۔ اس کا بڑا نظر باز یا دیدہ تھا۔ ہم ناشتہ کر رہے تھے آکر آنکھیں گاڑ دیں اتنی بڑی سیانی لڑکی اور ایسا ندیدہ پن۔

دلہن شریف گھرانے کی بیٹی تھی۔ ساس نے بہتیرا کریدا مگر اس نے اصلی بات کا پتہ تک نہ لگنے دیا۔ ساس کے جاتے ہی تھوڑی دیر کے بعد حسب معمول باورچی خانہ میں جا پہنچی تاکہ کسی کو منہ ملانے کا موقع نہ ملے۔ رات کو میاں آئے تو ان پر اپنا رنج ظاہر نہ ہونے دیا۔

اسی طرح ایک پندھرواڑا گزر گیا۔ نہ عینک پر بحث ہوئی نہ کسی اور طرح کی جلی کٹی۔ دولھا میاں اپنی عینک کی طرف سے نچنت ہو گئے اور دلہن بیوی بھی گمان سے شک میں پڑ گئیں۔ اس کے دل پر جو کدورت بیٹھی تھی وہ دھلنی شروع ہو گئی۔

ساس تو اب بالکل گوشہ نشین ہو گئی تھیں۔ یا پٹاری کھلی رہتی یا تسبیح ہلایا کرتیں۔ گھر میں کچھ ہو۔ کوئی آئے کوئی جائے انہیں کچھ واسطہ نہ تھا اور خوش تھیں کہ دلہن پانچوں انگلیاں پانچوں چراغ نکلیں گھر روشن ہو گیا۔ مہمان آتے تو دعا سلام کے سوا انہیں اور کسی سے غرض نہ تھی دلہن ان کی خاطر مدارات کرتیں دلہن ہی کے پاس سب بیٹھتے اور وہی کھلاتی پلاتیں۔

دلہن کی ایک خالہ تھیں۔ پہلے تو ان سے زیادہ میل ملاپ نہ تھا لیکن شادی کے بعد انہوں نے آنا جانا شروع کر دیا تھا کئی مرتبہ آئیں تو اکیلی۔ اب کے جو ان کا آنا ہوا ان

کی بیوہ لڑکی بھی ساتھ آئی۔ لڑکی صورت شکل کے لحاظ سے پری زاد تھی۔ مرد تو مرد عورتیں بھی اسے دیکھتیں تو عاشق ہو جاتیں۔ بیوہ ہوئے کوئی چھ مہینے گزرے تھے۔ یہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ شہزادوں میں پردہ نہیں ہے۔ سگے ہوں یا سوتیلے سب آپس میں ایک دوسرے کے سامنے ہوتے ہیں۔ آخری ہفتہ تھا۔ مرزا آڑے بھی کچہری سے سیدھے گھر آگئے دیکھا تو گھر میں مہمان آئے ہوئے ہیں۔ تھکے ہوئے دماغ کو ہنسی مذاق کی ضرورت ہوتی ہے۔ شہزادوں سے زیادہ ہنسوڑ اور آزاد کون ہوگا۔ بات بات میں قہقہے اڑنے لگے مرزا آڑے کی سیاہ عینک پر بیسیوں پھبتیاں ہوگئیں۔ دلہن کھولتی رہیں مگر کہتیں کیا۔ منہ بنائے بھی نہ بنتی۔ اگر ذرا بھی تیوری پر بل پڑتے تو انہیں بھی بنا لیا جاتا۔ بہن اور خالہ کا ساتھ دینے کو جھوٹ موٹ یہ بھی ہنسنے کی صورت بنا لیتیں۔

چراغ جلے تک اسی طرح چہلیں ہوتی رہیں۔ دلہن نے پہلے تو عینک کے جلاپے میں کچھ خیال نہیں کیا۔ پھر جو یکایک میاں کے چہرے پر نظر پڑی تو خالہ زاد بہن کی طرف تھا۔ دیکھنا تھا کہ کلیجے پر تیر سا لگا۔ ماما کی نواسی یاد آگئی۔ گھور کر میاں کی طرف دیکھا مگر وہ بیچارے اپنی آنکھوں کی غلط نگاہی سے مجبور تھے۔ چہرے کا رُخ بدلتے تو نظریں بیوی کی طرف سے ہٹ جاتیں۔ اتنے میں دسترخوان بچھا۔ کھانا آیا۔ سب کھانے بیٹھے۔ دلہن نے سر کے درد کا بہانہ کیا۔

خالہ: بیٹی یہ کیسی مہمانداری ہے۔ تم کیوں الگ بیٹھ گئیں۔

دلہن: سر میں درد بڑی شدت کا ہے۔ آپ کھائیے۔ ذرا طبیعت سنبھل جائے تو میں بھی کھا لوں گی۔

خالہ کی بیٹی: ایسی بھی طبیعت کیا خراب ہے آؤ بیٹھو بھی۔

مرزا آڑے: سر میں درد ہے پیٹ میں تو درد نہیں۔ معلوم ہوتا ہے تھک گئی ہو۔ لو میں تو لاے بنا بنا کر دیتا ہوں۔

دسترخوان پر بھی بیٹھنے کی ترتیب وہی تھی کہ بات کرتے بیوی سے اور منہ ہوتا خالہ کی بیٹی کی طرف۔ منہ تو اُدھر تھا ہی وہ یہی سمجھی کہ بہنوئی مجھ سے مخاطب ہیں ایک زور کا قہقہہ لگا کر کہنے لگی: "اور کھانے سے فارغ ہو کر پاؤں بھی دبا دیجئے گا۔"

مرزا آڑے: لیکن درد تو ان کے سر میں ہے۔

خالہ کی بیٹی: ہمارے کُنبے میں پاؤں بھاری ہونے سے سر میں دھمک پیدا ہو جاتی ہے۔

دلہن: بس بی طلعت اپنے چونچلے رہنے دو۔ اپنی ہائی اور پر گنوائی۔

خالہ کی بیٹی: (قہقہہ لگا کر) میرا تو سر دبانے والا رہا نہ پیر۔

دلہن: پھر کیا ڈر ہے۔ بھائی بند سلامت رہیں۔

مرزا آڑے: ہائیں ہائیں۔ آپ تو بگھر چلیں۔ اچھا آؤ کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔

خالہ جان۔ طلعت آرا بیگم آپ تو شروع کریں۔ یہ بھی کھائیں گی۔

دلہن کا آخری فقرہ خالہ کو بھی بُرا معلوم ہوا اور ان کی بیٹی کو بھی۔ زبان سے کچھ نہ کہا۔ کھانا کھانے لگیں۔

دلہن کی نظریں میاں کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں اور میاں کا رُخ طلعت آرا کی طرف حالانکہ وہ دیکھ رہے تھے بیوی کے تیور۔ خالہ آئی تو تھیں رات کو رہنے کے ارادے سے لیکن دسترخوان کی چُہل نے کچھ ایسی بدمزگی پیدا کی کہ ہاتھ دھوتے ہی رخصت چاہی۔ دلہن نے بھی زیادہ اصرار نہیں کیا۔

مہمانوں کے جانے کے بعد مرزا آڑے اپنے پلنگ پر جا لیٹے اور دلہن اپنے پلنگ پر منہ لپیٹ کر پڑ گئیں میاں کی چھیڑ چھاڑ کا جواب بھی نہیں دیا۔ جلاپے کی گرمی سے رات ہی رات میں بخار ہو گیا۔

صبح کو مرزا آڑے جو اُٹھے تو ان کی کچھ آنکھ لگ گئی تھی۔ جگانا مناسب نہیں سمجھا دفتر جلدی جانا تھا ماماؤں سے یہ کہتے ہوئے کہ بیگم اُٹھیں تو ان سے کہہ دینا کہ میرا ناشتہ دفتر میں بھیج دیں چلے گئے۔ ادھر جوں جوں دن چڑھا دلہن کا بخار بڑھتا چلا۔ دوپہر تک وہ شدت ہوئی کہ سارا گھر گھبرا گیا۔ مرزا آڑے جو بارہ بجے کے قریب آئے تو کیسا کھانا کیسا پکانا دلہن کی اللہ آمین منائی جا رہی تھی۔ ساس بولائی بولائی کبھی اِدھر جاتیں کبھی اُدھر۔ مرزا چڑمٹی نے حکیم ڈاکٹروں کا تانتا باندھ دیا تھا۔ دلہن دو جیا تھیں۔ اس لئے زیادہ فکر تھی۔ مرزا آڑے نے جو یہ حالت دیکھی تو ان کے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ دلہن کے پاس جا کر ماتھے پر جو ہاتھ رکھتے ہیں تو تپ تو ا۔ آنکھیں چڑھی ہوئی۔ سانس کی دھونکنی چل رہی ہے۔

مرزا آڑے: امّاں جان یہ بیٹھے بٹھائے کیا ہوا؟ میں تو اچھا بھلا سوتا چھوڑ کر گیا تھا۔

امّاں جان: میاں خدا کی باتیں خدا ہی جانے۔ سُنتی ہوں کہ بخار تو رات ہی کو ہو گیا تھا

مرزا آڑے: پھر کیا ہو گا؟

امّاں جان: جو خدا کو منظور ہے۔ اپنی سی تو سب ہی کچھ کر رہے ہیں۔ مگر بخار اترنا تو کیسا ہلکا ہونے پر نہیں آیا۔

مرزا آڑے: کسی سے کوئی بات بھی نہیں کی؟

امّاں جان: نہ سر سے کھیلتی ہیں نہ منہ سے بولتی

مرزا آڑے: آپ نے ہوشیار کر کے حال تو پوچھا ہوتا۔

اماں جان: میں تو کئی دفعہ پوچھ چکی۔ اب تم جا کر پوچھ لو۔

مرزا آڑے: ان کے میکے میں تو کہلا بھیجا ہوتا۔

اماں جان: ہاں بھئی اطلاع تو کرنی چاہئے۔ میرے تو صبح سے اوسان ٹھیک نہیں تم کسی کو بھیج دو نہیں تو ساری عمر جوتیاں کھانی پڑیں گی۔

مرزا آڑے نے ادھر تو ایک ماما کو سسرال بھیجا اور اُدھر بیوی کے پاس آئے۔ ڈاکٹروں نے ہر چند ممانعت کر دی تھی کہ مریضہ کے قریب بیٹھ کر کوئی بات تک نہ کرے۔ خاموش پڑا رہنے دیں۔ خطرے کی کوئی بات نہیں۔ بخار کی تیزی سے یہ کیفیت ہے۔ بخار جس وقت اُترنا شروع ہوا خود بخود ہوش آجائے گا۔ مگر دل نہ مانا۔ پہلے تو جا کر سرہانے کھڑے ہوئے۔ دو چار منٹ خاموش کھڑے دیکھتے رہے۔ پھر آہستہ سے آواز دی "بیگم! دلہن بولتی نہیں۔ خفا ہو"؟

مرزا آڑے: کیا حال ہے کچھ منہ سے کہو۔

دُلہن: (کراہتے ہوئے) اُف کلیجہ پھُنک رہا ہے۔ اندر نہ جانے کتنی بھٹیاں سُلگ رہی ہیں۔

مرزا آڑے: بخار کی گرمی ہے۔ حکیم واصل خاں کو لاؤں۔ ڈاکٹری دوائیں تو اور آگ لگا دیتی ہیں۔

دُلہن: ہو چکی۔ میری تقدیر میں اسی آگ سے جلنا لکھا ہے۔ میں ستی ہو رہی ہوں۔

مرزا آڑے: (پٹی پر دونوں طرف ہاتھ ٹیک کر جھکتے ہوئے) میں تو ابھی زندہ ہوں پھر تمہارا ستی ہونا کیا؟

دلہن: اپنے دل سے پوچھو؟

مرزا آڑے: جو تم کہو پوچھوں۔

دُلہن: خراب باتوں سے کیا فائدہ۔ میں نہ ہوں گی تو خود تمہارا دل تم سے کہدے گا۔

یہ کہہ کر دلہن نے ایک ایسا گہرا سانس لیا اور ان کے گلے میں سے ایک ایسی آواز نکلی کہ مرزا آڑے ڈر گئے۔ دل بھر آیا۔ آواز دے کر والدہ کو بلانا چاہا کہ اتنے میں مریضہ پر ایک تشنجی کیفیت طاری ہوئی۔ ہاتھ اوپر کو اُٹھے۔ میاں کا چہرہ قریب تھا۔ سیدھے ان کی عینک سے جا اُلجھے۔ عینک اُتر گئی۔ اسی لمحہ میاں کی آنکھوں کی طرف دیکھنے کے بعد) ایسے لینا میں چلی۔ یا اللہ یہ بھینگی آنکھوں والا ملک الموت! مجھے ڈراؤ نہیں۔ میں یہ ترچھی آنکھیں نہیں دیکھ سکتی۔ کلیجہ چھلنی ہو گیا۔

مرزا آڑے: (چونک کر آنسو پوچھتے ہوئے) بیگم! اس میں میرا کیا قصور؟

دُلہن: نہ تمہارا قصور نہ میری خطا۔ کاش تم اوّل ہی روز عینک اُتار دیتے۔ میں گنہگار نہ ہوتی اور تم ..... اور تم .....

اتنا کہتے کہتے مریضہ پر غشی طاری ہو گئی۔

مرزا آڑے: بیگم بیگم! ہاں ہاں کہو کیا کہہ رہی تھیں۔ واقعی میں تمہارا گنہگار ہوں۔ میں نے تم سے اپنا عیب چھپایا۔

بہیتری میاں نے آوازیں دیں۔ والدہ بھی آگئیں۔ مرزا چرمٹی بھی غل سُن کر باہر سے آگئے۔ سب نے اپنے اپنے جتن کر لئے لیکن دلہن کو پھر ہوش نہ آیا۔ نہ آنکھ کھلی نہ زبان ہلی۔ ڈاکٹر حکیم اپنی اپنی حکمت دکھا رہے تھے۔ روپے کا کھلیان ہو رہا تھا۔ بے نتیجہ دو روز تک یہی کیفیت رہی اور آخر اسی بیہوشی میں ختم ہو گئیں۔ مرزا آڑے کی ترچھی آنکھوں نے پردے پردے میں وہ تیر مارے کہ گھر پھونک تماشا دکھا دیا۔

ایک جوان جان بدگمانیوں کا شکار ہوئی تو دوسرے کی جوانی میں سدا کا روگ لگ گیا۔ بیوی کے صدمے میں انہیں بھی تپ دق لگ گئی اور تیسرے سال وہ بھی بیوی کے پہلو میں جا سوئے۔ مرزا چرمٹی اور ان کی بیوی عمر بھر روتی رہے۔

٭

خالہ خوبن

خالہ خوبن کے ابا کریم الدین سادہ کار تھے۔ شہر کے اچھے کاریگروں میں ان کا شمار ہوتا تھا شاگردی میں رہے تو دو دو روپے روز کمائے خود کام کرنے لگے تو پانچ پانچ اور دس دس روپے کی مزدوری کر کے اٹھے۔ کارخانہ دار بنے تو خدا نے ایسی برکت دی کہ دو تین ہی برس میں کئی مکان خرید لیے۔ لیکن بعض آدمیوں کی تقدیر اکیلی خوب لڑتی ہے۔ جب تک بن بیاہے رہے بڑے دھڑلّے سے کارخانہ داری کی۔ نہ گھر والوں کو کوئی شکایت نہ باہر والوں کو۔ جن جوہریوں کا کام بناتے، وہ بھی میاں کے سبھاؤ کی تعریفیں کرتے۔ اور کاریگر بھی خوش تھے۔

شادی کیا ہوئی کہ میاں کریم الدین کا رنگ ہی بدل گیا۔ دوسرے ہی مہینے یہ معلوم ہوا کہ ان کے دماغ میں الّو نے کاٹ کھایا ہے۔ خدا جانے عقل کے خانے کی ٹھیک نکل گئی یا کیا بات ہوئی۔ کہتے ہیں کہ بیوی پیٹ بھر کے بدصورت تھیں، کالا رنگ منہ پر چیچک کے داغ۔ چوٹی بالشت بھر کی، دانت شریفے کے بیج۔ قد کوئی ساڑھے چار فٹ کا۔ اس پہ ناز و انداز وہ کہ پریاں بھی کیا کریں گی۔ یہ سب کچھ سہی گھر کی راحت کو لوکا لگ گیا۔ مگر دنیا میں ایسا ہوتا ہے۔ اس کے یہ معنی تو نہیں کہ آدمی انسانیت سے خارج ہو جائے۔ قسمت سے لڑا نہیں جاتا۔ اب جیسے پلّے بندھ گئی۔ بیوی سے رغبت نہ رکھتے مزاج میں کیوں پھپھوندی لگ گئی۔ دماغ پر کس نے لال مرچیں چھڑک دیں۔

اندر اور باہر سب جگہ اور ہر ایک کے ساتھ پھاڑ دں کھاؤں کیوں کرنے لگے۔

بہرحال اس عام بدمزاجی کا نتیجہ یہ نکلا اور نکلنا چاہئے بھی تھا کہ کاریگر ایک ایک کرکے اُٹھنے لگے۔ گاہک ٹوٹ گئے۔ آخرکار کارخانہ بند کرکے گھر میں کام شروع کیا۔ لیکن دماغ کی بھٹی میں کوئی ایسی خرابی آگئی تھی کہ ہر وقت شعلہ بنے رہتے تھے۔ پُرزہ ہاتھ میں جھیل رہے ہیں۔ اتفاق سے اوزار ہاتھ سے چھوٹ پڑا۔ بس قیامت آگئی۔ جتنے پُرزے ہاتھ کے نیچے ہوئے سب پر ہتھوڑا بجا دیا۔ بھٹی پر بیٹھے کوئلوں نے تاؤ نہ دیا۔ بھٹی کی بھٹی کو اُلٹ پھینکا۔ ایسی صورت میں روزانہ پانچ سات روپے کا سونا خاک میں مل جاتا۔

اسی اثنا میں سال کے اندر اوپر تلے تین بچے بھی ہوگئے۔ دو لڑکے ایک لڑکی، تینوں ماں کی صورت کے۔ باپ کی صورت پر ایک نہ گیا۔ اللہ کی قدرت کسی کا اس میں کیا دخل۔ میاں کریم الدین بچوں کو دیکھتے اور سر دُھنتے۔ تاہم اپنی اولاد تھی۔ ان کا ملان رکھنے میں کبھی کسر نہیں کی۔ ساری تقریبیں بھی اسی طرح کیں جیسی کرنی چاہیئے تھیں۔ اس سلسلے میں چاروں مکان بیچ ڈالے۔ لیکن دماغ بھی ساتھ ہی اور زیادہ بگڑتا چلا گیا۔ پہلے تو صرف اوزاروں اور بھٹی سے لڑا کرتے تھے۔ اب ہوا سے لڑنے لگے۔ گرمی، سردی اور برسات سے مورچے بندھتے۔ مکھیوں اور مچھروں سے کشتیاں لڑی جاتیں۔ ہوا بند ہے پنکھا جھل رہے ہیں اور کوئی ہوا کا جھونکا آگیا "حرام زادی اب کیوں چلی۔ مجھ سے بیر باندھا ہے"۔ گالیوں کا طومار باندھ دیا۔ گرمی کا موسم ہے۔ کام کر رہے ہیں۔ کونڈے میں پسینے کی بوند ٹپکی بکھر گئے۔ کونڈا توڑ ڈالا۔ سردی ہے ہاتھ ٹھٹھرے ہوئے ہیں۔ چٹکی کام نہیں دیتی۔ آگ کے انگارے اُچھلنے لگے۔ اوپر موسلا دھار بارش ہو رہی ہے ادھر یہ کڑک رہے ہیں۔ کھانا کھانے بیٹھے۔ مکھیاں دسترخوان پر آئیں۔ ان کی بانڈی چلی

برتن توڑ ڈالے۔ پتیلی اُلٹ کر رکھ دی۔ روٹیاں انگنائی میں پڑی ہیں تو کھانا دالان میں بکھر گیا۔ رات کو مچھروں کی بھنبھناہٹ کان میں آئی اور یہ لٹھ لے کر اُٹھے، دھمال مچادی۔

غرض کہ اس دماغی کیفیت اور اس طوفانی دور میں تینوں بچوں نے جنم لیا۔ آخران میں صلاحیت کس طرف سے آتی۔ ماں تھیں اس قماش کی باپ تھے تو ان کا یہ رنگ۔ کریم الدین کی بیوی یعنی بچوں کی والدہ مکرمہ صورت تو گئی چولھے میں اگر سیرت کی بھی اچھی ہوتیں تو نہ گھر کا یہ دھاڑا ہوتا نہ اولاد کے طور بگڑتے۔ لڑکے تو مرد ذات تھے۔ ہوشیار ہو کر زیادہ تر باہر رہنے لگے۔ آج کل جیسا نا پرس زمانہ نہیں تھا، دوسروں کو دیکھتے دیکھتے ان کی کچھ نہ کچھ آنکھیں کھل گئیں لیکن خالہ خوبن کے لیے تو صرف ماں ہی ماں تھیں۔ ماں کے سوا وہ اور کس کے نقش قدم پر چلتیں۔ ماں کے سوا اور کس کی عادتیں اختیار کرتیں۔ ماں سینے پرونے کھانا پکانے میں تو خاصی ہوشیار تھیں۔ اس کے علاوہ نہ انہیں خانہ داری کا سلیقہ تھا نہ شوہر پرستی کا مادہ۔ اس کڑکھائی اور بھونڈی صورت پر آٹھ پہر بناؤ سنگھار دن میں چار چار مرتبہ صابن سے مُنہ دھل رہا ہے۔ مِسّی کاجل سے فرصت نہ تھی۔ بیٹی کو کوئی نصیحت نہیں کوئی فضیحت نہیں۔ باتیں کرتیں تو میاں کی بُرائی۔ کوسنا، پیٹنا حالانکہ کریم الدین باوجود دماغی توازن درست نہ ہونے کے بھی بیوی بچوں کے ساتھ بُرے نہ تھے۔ مرتے مرتے انہوں نے کبھی گھر میں کسی بات کی تکلیف نہیں ہونے دی۔ بیوی کی ہر خواہش جس طرح ہو سکا پوری کی۔ گالیاں ان کا روزمرہ تھا مگر براہ راست بیوی یا بچوں کو بھول کر بھی ہوں سے توں نہیں کہا۔ نقصان کرتے تو اپنا۔ آپے کو پیٹتے تو اپنے۔

میاں کریم الدین نے اپنے جیتے جی بڑے بیٹے کی شادی بھی کر دی تھی۔ تقدیر سے بہو آئی تو روگی۔ بیچارے کو بڑھاپے اور مفلسی میں یہ اور صدمہ ہوا۔ خالہ خوبن کا بھی

دوسرے سال نکاح کر دیا۔ جہیز کا سامان نہیں جڑا تھا اس لئے ابھی رخصت نہیں ہوئی تھی کہ اجل آگئی۔ خالہ خوبن کا جھوجرا نصیب بالکل ہی پھوٹ گیا۔

نکاح ہو چکا تھا۔ نکاح بھی چوری چھپواں نہیں۔ پنجوں کے سامنے دوسرے خالہ خوبن بھی برادری والوں کی بیٹی تھیں۔ چھٹے مہینے جوں توں کر کے سسرال پہنچ گئیں لیکن جیسی سونے چھونے سے لدی ہوئی بیٹی کی آؤ بھگت ہوتی ہے وہ اُن کی کون کرتا بلکہ چھوٹی قوم والوں کی طرح جاتے ہی بے چاری پر طعنے پڑنے لگے۔ دو بہ بدو کرنے کی انہیں بھی عادت نہ تھی۔ ساس نندیں جو کچھ کہتیں کانوں سے سنتیں اور آنسوؤں کی طرح پی جاتیں لیکن ساتھ ہی وہ طور طریق بھی نہیں آتے تھے جن سے غیر اپنے بن جاتے ہیں۔ صورت شکل میں عین مین دوسری ماں۔ چیچک کے داغوں کے سوا ساری وضع قطع وہی۔ پھر جوانی کا روپ بھی نہیں۔ مٹاپے نے اللہ میاں کی بھینس بنا دیا تھا۔ اس پر نزاکت کا یہ عالم کہ اُٹھ کر پانی نہ پئیں۔ آٹا گوندھتے میں بھوسی کی پھانسیں لگ جائیں۔ وہ جو کہتے ہیں کہ خدا صورت بُری دے تو نصیب بُرے نہ بنائے اور نصیب بُرا بنائے تو عادتیں نہ بگاڑے۔ یہاں صورت اللہ کا نور تھی تو تقدیر نورٌ علی نور اور عادتیں بہادر شاہی۔

میاں کا نام محمد احمد تھا۔ اسے مرے ہوتے برسوں گزر گئے جو جس کا جی چاہے کہے مگر ایمان کی پوچھو تو جتنے کیڑے آج اس کی قبر میں ڈالے جاتے ہیں مرنے والے پر ظلم ہے۔ اس صورت شکل پہ بھی اس نے کئی برس تک ان کو بیوی سمجھا اور نباہنے کی کوشش کی لیکن یہ ٹھہریں دیوانی ماں کی خبطی بیٹی۔ انہوں نے ایک دن میاں کے ساتھ بیویوں کا سا برتاؤ نہیں کیا۔ ایک سال تک تو گھونگھٹ سے منہ نہیں نکالا جب میاں کو دیکھا پیٹھ موڑلی۔ ساس نندیں ہار گئیں کیا مجال جو خالہ خوبن اپنی بانی چھوڑتیں۔

لاکھ میاں نے اس مٹی کے تھوے کو چاہا کہ آدمی کی جون میں آئے لیکن کوئی کاریگری نہ چلی۔ اتنے میں جاپے کے دن آگئے۔ درد شروع ہوئے۔ اپنی کوٹھڑی میں گٹھڑی بنی بیٹھی ہیں۔ اندر سے کنڈی لگالی ہے۔ ساس نندیں باہر سے آوازیں دے رہی ہیں۔ دائی آئی بیٹھی ہے۔ کراہنے کی آوازیں آرہی ہیں مگر کنڈی نہیں کھولتیں: "اری نگوڑی مرجائے گی۔ کنڈی تو کھول"۔

"اے دُلہن! تمہیں کیا ہو گیا ہے بچہ پیٹ میں مرجائے گا"۔

"نیک بخت تم تو سچ مچ دیوانی نکلیں۔ کنڈی کھولو"۔

ساس الگ بُرا بھلا کہہ رہی ہیں، نندیں جُدا۔ دائی کا چیختے چیختے حلق تھک گیا۔ میاں کے کواڑ پیٹتے پیٹتے ہاتھ لال ہو گئے مگر خدا کی بندی ایک نہیں سنتی۔ آخر میاں نے کواڑوں کی چول اتار دی۔ ساس نندیں اور دائی اندر گئیں۔ دیکھا تو خالہ خوبن آنکھیں بند کئے، پیٹ کو دبائے ایک کونے میں ٹسکیاں لے رہی ہیں۔ اب دائی لٹانا چاہتی ہے تو لیٹتی نہیں۔ گٹھڑی بنی چلی جاتی ہیں۔ دائی کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ یا اللہ عورت کیا ہے سچ مچ کا تماشا ہے۔ ہنسی کی ہنسی اور سیاپا کا سیاپا۔ پڑوسنیں کوئی اِدھر سے جھانک رہی ہے کوئی اُدھر سے کہ بی ہمسائی کاہے کی دال پکائی جس میں نمک نہ کھٹائی۔ اوئی اچھی بہو لائیں"۔

دوسری کہتی "بہن شرمیلی ہے"۔

تیسری، "ایسا تھا تو شادی کیوں کی تھی۔ اب جو اس کا ظہورا نکلا تو شرم آتی ہے"۔

اِدھر باہر یہ باتیں بن رہی تھیں اُدھر کوٹھڑی میں دائی خالہ خوبن سے کشتی لڑ رہی تھی، پکے دن تھے، خالہ خوبن بھی کمزور نہ تھیں۔ پیٹ کا بچہ بھی طاقت ور تھا۔ ایک دفعہ ہی

درد زور کے اُٹھے۔ قدرتی طور پر اعصاب ڈھیلے پڑتے ہی بچہ پیدا ہوگیا۔ یعنی وہ خود زور مار کر نکل آیا ورنہ خالہ خوبن کیا اپنے بس اسے نکلنے دیتیں۔

سب کو بیٹے کی آرزو ہوتی ہے۔ محمد احمد کو بھی بڑا ارمان تھا کہ بیٹا ہوگا یوں گودی میں چڑھائے کندھے پر بٹھائے پھروں گا۔ یاروں میں مونچھیں نیچی نہیں ہوں گی۔ لیکن اللہ میاں نے اس امید پر بھی پانی پھیر دیا۔ لڑکی ہوئی۔ سنتے ہی وہم ہوگئے۔ ساری خوشی خاک میں مل گئی۔ ساس نندیں بھی چپ چپ تھیں۔ ہمسائیوں نے الگ جان کھانی شروع کی

"کیوں بُوا کیا ہوا؟ تو آیا کڑھائی؟ کٹھیا نکلی یا کٹھڑا؟"

ساس: بُوا تم پر کیا تو آئی آئی جو نصیب میں تھا ہوگیا۔

ہمسائی: بُوا تو آئی آئے نہ آئے تم پر۔ نہ بتاؤ۔

نند: ارے بی لڑکی ہوئی ہے۔

دوسری ہمسائی: پرائے دھن کی کیا مبارکبادی۔

ساس: تو کیا اب اسے کوڑی پر پھینک دیں۔

ہمسائی: بُوا جیتی رہے نصیب کی اچھی ہو۔

دوسری ہمسائی، صورت کیسی ہے۔ ماں پر ہوگی۔

نند: نہیں بی۔ خدا رکھے باپ کی صورت کی ہے۔

ہمسائی: چلو کچھ تو آنسو پونچھے۔

لڑکی واقعی آنکھ ناک رنگ روپ میں یہ معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ خالہ خوبن کے پیٹ سے نکلی ہے۔ محمد احمد نے دوبارہ آکر جو دیکھا تو وہ بھی خوش ہوگئے۔ لیکن خالہ خوبن کی رفتار میں ایک بچے کی ماں ہونے کے بعد بھی ذرا فرق نہ آیا بلکہ ان کا بے ڈھنگا پن

اور زیادہ نمایاں ہونے لگا۔ جاپے کے دو تین دن تو جس قیامت کے گزرے دیکھنے والے اگر بیان کریں تو سننے والوں کو یقین نہیں آسکتا۔ ساس نندیں رو رو دیں۔ دائی نے توبہ کرلی کر "بیوی اب کھائی سو کھائی آگے کھاؤں تو رام دہائی۔ سو بندی تو باز آئی۔ بچے جم جم ہوں، دوسری دائی کا بندوبست کرلینا۔" جس کل لٹاتے ہیں لیٹتی نہیں۔ بدن کو ہاتھ لگایا اور گھٹڑی بنیں۔ ہاتھ پاؤں اکڑا لیئے۔

چھٹی نہانے کی نوبت کیا آئی کہ چتوڑ کا قلعہ فتح کرنا ہوا۔ وہ خاموش کشمکش کہ اللہ کی پناہ۔ بچّی کو گود میں دیا کہ چھاتی اس کے منہ میں دو۔ گھٹنے پیٹ سے لگا لیے۔ پیٹھ موڑ لی۔ بچّی بھوکی رو رہی ہے اور خالہ خوبن ہیں کہ ماش کا آٹا بنی ہوئی ہیں۔ محمد احمد بیچارہ حق حیران کھڑا تماشا دیکھ رہا ہے۔

نند: ارے بی یہ کیا مصیبت ہے۔

ساس: کم بخت بچّی کی بھی ماتا نہیں۔

محمد احمد: یوں بچّی ہلاک ہو جائے گی۔

ساس: آج دودھ نہیں اُترا تو پھر کبھی نہیں اترے گا۔ ہمارا تو ناک میں دم آگیا۔ (محمد احمد سے) کوٹھڑی میں لے جا کر دونوں کو چھوڑ دو۔ شاید اکیلے میں ماتا آجائے۔

نندیں اُٹھا کر کوٹھڑی میں لے گئیں اور بچّی کو پلنگ پر لٹا کر کواڑ بند کر دیئے۔ تھوڑی دیر کے بعد جھریوں میں سے جو دیکھا تو بندریا کی طرح چھاتی سے لپٹائے ہوئے ہیں جانوروں کو اپنے پیٹ سے نکلے ہوؤں کی ماتا ہوتی ہے۔ خالہ خوبن کیا ان سے بھی گئی گزری تھیں؟ نہیں۔ انہیں بھی اولاد سے ایک ماں کو جیسی محبت ہونی چاہیئے تھی لیکن وہ جو ماں باوا کی طرف سے دماغ کی کوئی خاص چول اینٹھی ہوئی ملی تھی اس کی خرابی کہاں

جاتی۔ وہ جذبہ برابر کارفرما تھا۔ ایسی احمقانہ شرم بھی دنیا میں نہیں۔ انتہا سے زیادہ شرمیلی کوئی لڑکی ہوتی تو غیروں کے سامنے چھاتی نہیں کھولتی۔ گرمی کا موسم ہوا تو دوپٹہ اوپر سے ڈال لیا۔ جاڑا ہوا تو رضائی۔ چلو پردہ ہوگیا، یہ تو ایک حمام میں سب ننگے والی بات ہے، مگر خالہ خوبن کو اس سے کیا واسطہ؟ ان کی ایک حرکت میں فرق نہ آیا۔ کوٹھڑی میں بیٹھی ہیں بچی گود میں ہے۔ غیر تو غیر ساس نندوں میں سے کوئی سامنے سے گزرا اور اس خدا کی بندی نے بچی کو زمین پر پٹخا۔

انسان کی کیا مجال ہے کہ بچوں کو پالے۔ پلوانے والا تو کوئی دوسرا ہی ہے۔ وہ رکھوالی نہ کرے تو ایک بچہ پل بھر نہ جئے۔ پھر خالہ خوبن کی بچی جیسے بندر کے ہاتھ میں ناریل کہنا چاہئے۔ بندریا کا تماشا کبھی دیکھا ہے؟ اپنے بچے کو چھاتی سے چمٹائے چمٹائے پھرے گی لیکن جب دھوپ کی تیزی سے منڈیر پر بیٹھے بیٹھے چوتڑ جلنے لگیں گے تو جھٹ اسے اپنے چوتڑوں کے نیچے رکھ لے گی۔ بالکل یہی کیفیت خالہ خوبن کی تھی۔ خاصی دودھ پلا رہی ہیں کسی کی آہٹ سنی اور بچی کو پھینک پیٹھ موڑ بیٹھ گئیں۔ بچی بلک بلک کر ہلکان ہو جائے ان کی جوتی کی نوک سے۔

ایک دن رات کو کوئی نو بجے میاں گھر میں آئے تو دودھ کا کلھڑا ہاتھ میں لئے ہوئے کوٹھڑی کے کواڑ بند تھے خالہ خوبن پلنگ پر بیٹھی بچی کو دودھ پلا رہی تھیں۔ کواڑ کھلتے ہی تین مہینے کی ننھی سی جان کو چھاتی سے چھڑا کر اس طرح پلنگ پر ڈالا کہ وہ لڑھک کر پٹی سے نیچے آرہی۔ وقت ہی تو ہے۔ میاں کو بھی غصہ آگیا۔

میاں (غصہ کو ضبط کرکے) نیک بخت کیوں تو نے جلا رکھا ہے۔

خالہ خوبن اور سکڑ گئیں۔

میاں : اری کیا دم نکل گیا۔ بچّی کو تو دیکھ مر تو نہیں گئی۔ اب اسے اٹھائے گی بھی۔

خالہ خوبن : (بہت آہستہ سے) اُٹھالو۔

میاں نے دانت پیستے ہوئے بچّی کو اُٹھایا وہ بے ہوش تھی۔

میاں : یہ تو ٹھنڈی ہے۔ بدنصیب گود میں لے کر چھاتی سے لگا۔

خالہ خوبن : تم جاؤ

میاں : میں جاؤں ؟

خالہ خوبن : ہاں تم جاؤ۔

میاں : میرے سامنے دودھ نہیں پلائے گی ؟

خالہ خوبن : شرم آتی ہے۔

میاں : (دانت پیس کر) بس اب تو اپنی شرم میں رہ میں تو جاتا ہوں۔

یہ کہہ کر محمد احمد کوٹھڑی سے تو کیا گھر سے ہی نکل گئے اور پھر مرتے دم تک بیوی کی صورت نہیں دیکھی۔ یہ نہیں کہ کہیں شہر سے نکل گئے ہوں لیکن بیوی بچّوں کو بالکل چھوڑ دیا ہو۔ نہیں رحمٰن کے کوچے اپنے چچا کے ہاں جا رہے اور وہیں سے جو کچھ بنتا خرچ کے لئے بھیج دیتے۔ کیونکہ دوسرے ہی برس ایک لڑکی اور پیدا ہو گئی تھی لیکن دو بچّوں کی ماں ہونے اور میاں کے اس طرح جانے کے بعد بھی خالہ خوبن کے کسی رنگ ڈھنگ، طور طریق میں فرق پڑا ہو کیا مقدور، خلقت کا نقص کہیں جاتا ہے۔ لڑکیوں کی مٹّی الگ خراب اپنا ہڈّا جدا۔ دودھ میں مکھی جیسا۔ میکے والوں میں اوّل تو کوئی تھا نہیں سب دور دراز کے رشتے دار تھے پھر جو دو چار تھے بھی تو ان کی عادتوں سے نالاں۔ دو دن کو کہیں جائیں تو اجیرن ہو جائیں۔ سسرال والوں کی سمائی واقعی قابلِ داد ہے کہ گیارہ برس انہوں نے ان کو نبھایا اور

اس بیماری کو خاموشی کے ساتھ اپنے گھر میں پالا۔ لیکن کس کے منہ سے ؟ محمد احمد کے۔ محمد احمد کا دل ضرور پھٹ گیا تھا اور پورے نو برس بیوی کی صورت نہیں دیکھی تاہم روٹی کپڑے کا برابر خیال رکھا۔ ماں بہنوں اور بھائیوں کو جیتے جی سدا تاکید رہی کہ اپنی طرف سے کوئی ایسی بات نہ نکلے کہ خدا کے ہاں دینی آئے۔ مرتے وقت بھائیوں کو وصیت کی کہ اگر وہ ہمارے گھر میں رہنا چاہیں تو جو خود کھاؤ وہ انہیں کھلانا۔ میری قبر پہ نہ ٹھکوانا۔ اور اگر وہ ضد کریں اور اپنے میکے میں جانا چاہیں تو بھی ہر طرح سے خیال رکھنا۔ لڑکیوں کی شادی کرنا تمہارا فرض ہے۔ دیکھنا خدا کو منہ دکھانا ہے۔ وہ تو عقل سے عاری ہیں تم بیوقوف نہ بن جانا۔"

غرض کہ محمد احمد نے آخری دم تک بیوی بچّوں کے ساتھ کوئی بُرا سلوک نہیں کیا۔ لیکن خالہ خوبن کی اوندھی مت سیدھی ہونی تھی نہ ہوئی۔ میاں مر گئے۔ یہ سوگ میں بیٹھیں سوگ میں بھی کیا مقدور جو کوئی طور بدلا ہو۔ وہی دوسرے دن کپڑے بدلنے۔ وہی چار گھنٹے میں غسل خانے سے نکلنا۔ وہی گھنٹوں کنگھی چوٹی۔ وہی چار وقت منہ ہاتھ دھونے میں صابن کی پوری ایک ٹکیا بہا دینی۔ وہی سب سے الگ تھلگ رہنا۔ مان والے سے سارے ارمان ہوتے ہیں اب تو یہ بال پڑا کھٹکا بھئی۔ سر کا وارث اُٹھ جانے کے بعد ان کی یہ باتیں کون برداشت کرتا۔ نندیں گھنانے لگیں۔ ساس دیکھتیں اور اندر ہی اندر کھولتیں کہ اب آخر یہ کس لئے بناؤ سنگھار کرتی ہے۔ رنڈاپے میں ایسی باتیں بھلا نہیں کرتیں اس لئے رفتہ رفتہ سارے گھر کی آنکھیں پھر گئیں۔ اتنے میں عدت کے دن ختم ہو گئے۔ اماں جان تشریف لے آئیں۔ دونوں ماں بیٹیاں مل کر خوب روئی بیٹھیں۔ مرنے والے کے جنم میں جتنا تھوکا گیا تھوکا۔ نندوں بھاوجوں نے ان کے جواب میں کچھ کہنا چاہا تو ساس نے روک دیا۔ کہا تو صرف اتنا کہا "بہن صبر! اگر میں نے کوئی برائی کی ہوگی تو میرے آگے آئے گی۔"

سمدھن : میں اب اپنی بچی کو یہاں نہیں چھوڑوں گی۔

ساس : گھر تو ان کا یہی ہے مگر میں ضد نہیں کرتی۔ جہاں یہ خوش رہیں، ہم سے جو خدمت ہو سکے گی کریں گے۔

دل سے یا دکھانے کے لئے اس کا حال تو اللہ کو معلوم ہے۔ ساس نے کہنے سننے کا حق ادا کر دیا۔ سوار ہوتے ہوتے گلے لگا کر روئیں اور کہا کہ "دلہن خدا رکھے تمہاری بچیوں کو میرے محمد احمد کی نشانیاں ہیں۔ ان کے جانے سے میرے گھر کی رونق جا رہی ہے۔ ایسا کرنا کہ آٹھ دن وہاں رہنا اور آٹھ دن یہاں" لیکن کُتے کی دُم بھی کبھی سیدھی ہوئی ہے سُسرال سے جو گیئں تو پھر اُدھر کا رُخ نہیں کیا۔ لاکھ ساس نے بُلایا۔ دیور لینے آئے مگر وہاں وہی مرغے کی ایک ٹانگ نہیں گیئں۔ آئے کو پُورا ایک سال بھی نہیں ہوا تھا کہ ماں مر گیئں۔ یہ ٹھکانا بھی گیا۔ دونوں ماں بیٹیاں سی پرو کر خاصا گزارہ کر لیا کرتی تھیں۔ اب ادھر دو دو لڑکیاں اور اکیلا ہاتھ۔ بڑی مشکل درپیش تھی۔ چاہیے تھا کہ اب تو سُسرال میں جا بیٹھتیں جا بیٹھتیں تو قاضی گلہ نہ کرتا۔ در بہ در کے دھکے کون کھاتا۔ پھر بھی آفریں ہے دیوروں کو کہ بھاوج کے ان نکتوڑوں کے باوجود جو ان سے بن سکا سلوک کرتے رہے۔ جب مہینے پندرہ دن میں آتے بھتیجیوں کے نام سے اتنا دے جاتے کہ روٹی کپڑے کی کبھی تکلیف نہیں ہوئی۔

لڑکیوں کو ترئی کی بیل کہتے ہیں۔ دنوں میں پھیلتی ہے۔ دو چار ہی سال کے اندر دونوں لڑکیاں جوان ہو گیئں۔ خالہ خوبن کی طبیعت ہی خدا نے نرالی بنائی تھی۔ اولاد کی چاہت کا رنگ بھی ان کا دنیا سے نرالا تھا۔ چاہتی تھیں کہ لڑکیاں سدا ان کے کولھے سے لگی بیٹھی رہیں۔ کبھی ان کے شادی بیاہ کا ذکر آتا تو منہ تھتھا لیتیں۔ مگر چچا برابر فکر میں لگے ہوئے تھے۔ اُدھر لڑکیاں خدا کی شان عادت خصلت، بات چیت میں ماں کے بالکل برعکس

جیسی پیاری پیاری صورتیں ویسی ہی باتیں۔ ملنساری کا یہ حال کہ اپنے اور پرائے سب عاشق۔ چنانچہ چچاؤں کا خیال ہوتے ہی پیغام پر پیغام آنے لگے اور دونوں کی ساتھ ہی باتیں ٹھہر گئیں۔

بیٹیوں کی شادی پر اماں جان بڑے فیل لائیں۔ فیل کے معنی یہ نہ سمجھنا کہ کسی طرح کی اودھم مچائی ہو یا ٹھن ڈالے ہوں۔ وہی پرانی باتیں۔ ادھر برات آئی بیٹھی ہے دلہن کی اماں کو بلا رہے ہیں اور یہ کبھی پاخانے میں۔ پاخانے سے نکلیں تو غسل خانے میں۔ غسل خانے سے کواڑ پیٹ پیٹ کر نکالا تو کوٹھے پر چڑھ کوٹھڑی میں جا بیٹھیں اور اندر سے کنڈی لگالی ہنسی کی ہنسی اور دکھ کا دکھ۔ سمدھنیں ایک ایک کا منہ دیکھیں کہ دلہن کی اماں تو ایک تماشا ہیں باہر سے آوازیں پر آوازیں پڑ رہی ہیں کہ جلدی کرو۔ خدا خدا کرکے کوٹھے سے اتار کر لائے تو اب منہ سے بات نہیں کرتیں۔ دلہن سے زیادہ لمبا گھونگھٹ نکال لیا اور پیٹھ پھیر کر ہو بیٹھیں۔ آخر تنگ آکر چچاؤں نے کہا کہ اچھا تم لوگ پردہ کرو دولھا تو اندر آئے۔ زوال سے پہلے رخصت ہو جائے تو اچھا ہے۔ براتی پریشان ہیں۔

پردہ ہوا دولھا اندر آیا۔ اتنے میں باہر جہیز سنبھلوا دیا۔ اب کہتے ہیں کہ بی بیٹی سے مل لو۔ دولھا لے جانے کو کھڑا ہے۔ اماں جان کبھی ادھر مسکوڑا لے کر ہو بیٹھتیں کبھی ادھر بہ مشکل کھینچ کھانچ کر دلہن کے پاس لائے تو ایسا چمٹیں جیسے چچڑی۔ چھوڑتی نہیں — دلہن غریب کا دم گھٹ گیا۔ جب چچا بکارے ہیں تو کہیں چھوڑا ہے۔

غرض کہ انہی کے سانگوں کے ساتھ ایک مہینے کے آگے پیچھے سے دونوں لڑکیوں کے بیاہ ہو گئے۔ اور خدا نے ان کو اپنے اپنے گھر کا کر دیا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ دونوں کو گھر بھی اچھے ملے اور میاں بھی اچھے۔ لڑکیاں بھی امید کے خلاف ایسی نکلیں کہ دو چار

ہی مہینے میں سسرال والوں کو اپنا گرویدہ کر لیا۔ اپنے شوق سے بیسیوں دستکاریاں سیکھ لیں۔ لکھنے پڑھنے میں بھی چاق ہو گئیں۔ اللہ کی قدرت کہ کس ماں کی اور کیسی بیٹیاں۔

شادیوں سے فراغت پانے کے بعد ایک مرتبہ پھر دیوروں نے آکر بھاوج سے کہا کہ "اب تم اکیلی رہ گئیں ہو اکیلے دم کے لئے الگ مکان کی کیا ضرورت ہے۔ تکلیف ہو گی اپنے گھر چلی چلو۔ پہلے تم کھانا پیچھے ہم کھائیں گے۔ داماودں کی آمد و رفت رہے گی۔ بیٹیاں بھی آئیں گی۔ کون ان کی آؤ بھگت کرے گا۔ مگر خالہ خوبن کیا ماننے والی تھیں۔ نہ جانا تھا نہ گئیں۔ دونوں دیور اپنا سا منہ لے کر چلے گئے۔

بھتیجیوں کا واسطہ اُٹھ جانے کے بعد دیوروں نے آکر بھاوج کو پوچھنا کم کر دیا۔ خالہ خوبن والوں کو یہ شکایت ہے لیکن وہ پوچھتے کس سے۔ آدمی کو یا مٹی کے ڈھیر کو لڑکیاں تھیں تو وہ چچا ابا چچا ابا کہہ کر چمٹ جاتیں ہنستی بولتیں۔ چچاؤں کا بھی آنے کو جی چاہتا۔ اب کس کے پاس آتے۔ ایک آدھ مرتبہ آئے بھی تو کنڈیاں پیٹ پیٹ کر چلے گئے۔ بھاوج بندی نے جواب تک نہیں دیا۔ انھوں نے تو اپنے پیروں میں آپ کلہاڑی ماری۔ اپنے بُرے دنوں کو آواز دے دے کر بلایا۔

شادیوں کے دو تین مہینے بعد تک تو لشتم پشتم جس مکان میں تھیں اسی میں رہیں کچھ اپنے پاس تھا کچھ بیٹیاں جب آتیں دو چار روپے چپکے سے دے جاتیں۔ اور جتنی دیر رہتیں کہ "بی ہمیں کیا ہو گیا ہے کیوں نہیں چچا مغل کے ہاں چلی جاتیں۔ اکیلے گھر میں تمہارا جی نہیں گھبراتا۔ مصیبت بیتنی تم کو اچھی معلوم ہوتی ہے۔ اور دیکھو اگر تم نے ہمارے لئے ایک سے دوسرا سالن پکایا تو ہم تمہارے پاس آنا چھوڑ دیں گے۔ خاطر ہو چکی تمہارا حال کیا چھپا ہوا ہے۔" ان تمام لیکچروں کا خالہ خوبن صرف یہ جواب دیتیں "بوائم تو پاگل

ہو گئی ہو۔ کیا میں داما دوں کے ہاتھوں اپنی ناک کٹوا دوں۔ آخر بیٹیاں بھی جھینک پیٹ کر بیٹھ رہیں اور انہوں نے بھی آنا کم کر دیا۔ نتیجہ کوڑھ مغزی کا یہ نکلا کہ خالہ خوبن کو مکان چھوڑ کر در بدر ہونا پڑا۔ اپنی ننھیال ددھیال والوں کے گھر تاکنے پڑے۔ وہ تو ہاتھ کی ہنر مند تھیں۔ سلائی کڑھائی ٹکائی میں اچھی مہارت تھی۔ کنبے میں جہاں ضرورت ہوتی بلالی جاتیں۔ ہر ایک خاطر سے رکھتا۔ لیکن اوّل تو یہ روز کا کام نہیں دوسرے نہ دو چار دن سے زیادہ ان کے نخرے کوئی اٹھا سکتا۔ نہ یہ کہیں گزارہ کر سکتیں۔ دس لوٹے پانی کے اور ایک ٹکیا صابن کی منہ دھونے کو چاہئے۔ غسل خانے میں جاتیں تو صبح سے دوپہر اور دوپہر سے شام ہو جاتی۔ گھر والے پریشان ہو جاتے۔ پھر اپنی ہنڈیا الگ پکاتیں۔ کسی کے گھر کا کھانا پسند نہ آتا۔ آن بان یہ کہ ناک پر مکھی بیٹھے تو ناک اڑا دیں۔ اچھا تو ان باتوں سے کسی کا کیا بگاڑتیں اپنی مٹی خراب کرتیں۔

بیٹیوں داما دوں نے بہت چاہا کہ ہمارے ہاں آکر رہیں۔ خالہ خوبن اور داما دوں کی روٹیاں کھائیں۔ انہیں قسم تھی کہ مہمان ہو کر بھی کسی بیٹی کے گھر نہیں گئیں۔ تیرے میرے ہاں پڑتی اور فاقے تک کرتی رہیں لیکن وہ جو اپنے مزاج کا رنگ تھا اسے نہ بدلا۔ مہینے دوسرے مہینے دیور آتے ترس کھاتے۔ دو چار روپے دے جاتے یا سلائی سے کچھ کماتیں وہ داما دوں کی دعوتوں کے لئے جوڑ جوڑ کر رکھتیں۔

وہ جو فارسی کی مثل ہے کہ جبل گردد جبلّت نہ گردد اس کا پورا مصداق خالہ خوبن کو دیکھا اب کہ پچاس سے اوپر عمر ہے۔ بالکل لٹک گئی ہیں۔ بیگن زمانے کے بھاڑ میں بھلبھلا گیا ہے۔ بال کرمٹّے ہو گئے ہیں۔ آدھا منہ بھی پوپلا ہے۔ کانوں سے بھی کم سننے لگی ہیں۔ کوئی حیثیت نہیں رہی۔ ڈولی میں کہاں سے بیٹھیں۔ برقعہ سر پر ڈال کر پھرنے لگی ہیں لیکن کیا

مقدور جو اپنی کوئی عادت چھوڑی ہو۔ رسی تمام جل گئی پر بل نہیں گیا۔

ہمارے پڑوس میں ان کے رشتے کی ایک بہن رہتی ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے بہت پیار ہے۔ مہینے میں دو چار مرتبہ ضرور ان کے گھر آتی ہیں اور کئی کئی دن رہتی ہیں۔ ہمارے اور ان کی اس بہن کے گھر میں صرف ایک پردے کی دیوار حائل ہے اور کوٹھے ملے ہوئے اس لئے خوب تماشے دیکھنے میں آتے ہیں۔ بعض دفعہ تو ان کی حرکتیں دیکھتے دیکھتے طبیعت اُلجھنے لگتی ہے۔ باتیں تو ان کی کبھی سمجھ میں آتی ہی نہیں کچھ ان کی بہن سمجھتی ہوں گی۔

ابھی کئی دن ہوئے آئی ہوئی تھیں۔ صحت خراب ہوگئی ہے۔ ڈاکٹری علاج پہلے بھی غریبوں کے بس کا نہ تھا۔ حکیموں کے نسخے دو دو چار چار پیسے کے ہوتے تھے۔ اسی سے لوٹ پیٹ کر اچھے ہو جاتے تھے۔ اور چیزوں کی گرانی کے ساتھ دواؤں کی قیمت بھی بڑھ گئی۔ سدا سب کا وقت یکساں نہیں رہتا۔ ایک دیور تو مرگئے اور وہی دل کے کھلے ہوئے تھے۔ دوسرے ہیں تو ان کا روزگار کئی کئی برس سے پٹ ہے۔ کلکتہ میں خدا جانے کیا کرتے ہیں۔ دامادوں اور بیٹیوں کے آگے ہاتھ پھیلانا اوّل تو ویسے بُرا ہے۔ پھر خالہ خوبن مرجائیں تو کسی بیٹی سے یہ نہ کہیں کہ پیسے کا شربت منگا کر میرے حلق میں ٹپکا دے۔ اچھا تو وہ اپنی بہن کے ہاں اب کے جو آئی تھیں تو اس لئے کہ ان کے ساتھ ہسپتال جائیں اور خیراتی علاج کریں۔ چنانچہ ایک دن مقرر ہوا کہ آج ہسپتال جائیں گی۔

صبح کی نماز سے فارغ ہوتے ہی ہسپتال جانے کی تیاری شروع ہوئی۔ پہلے تو پاخانے گئیں۔ لوٹے پر لوٹا پانی کا مانگا جا رہا ہے کہ بی پانی ٹھہر گیا۔ ایک لوٹا اور دے دو سویرے کا وقت سارا گھر بیٹھا جگالی کر رہا ہے اور خالہ خوبن نہیں نکلتیں۔ پورے گھنٹہ بھر میں پاخانہ سے نکلیں تو غسل خانے میں گھس گئیں۔ اب سب منہ دھونے کو بیٹھے ہیں۔ وہ کبھی

کہنیوں تک ہاتھ دھوتی ہیں تو کبھی پاؤں۔ کئی کئی دفعہ صابن ملا جا رہا ہے دانت منجھ رہے ہیں۔ سارا حوض پانی کا اور پوری ٹکیا صابن کی بہا کر غسل خانے کا پیچھا چھوڑا تو اب آئینہ اور کنگھی لے بیٹھیں۔ دن چڑھتا چلا آتا ہے اور خالہ خوبن کے ہاتھ سے نہ کنگھی چھوٹتی ہے نہ آئینہ لڑکیاں کہتی ہیں کہ خالہ ہسپتال آخر کب جاؤ گی۔ ڈاکٹر اٹھ نہ جائے۔ جلدی سے کھڑی ہو جاؤ۔

خالہ خوبن: ہاں بی دیکھو تیاری کر تو رہی ہوں۔ تم مجھے بولاؤ تو نہیں۔ خدا خدا کر کے کنگھی چوٹی سے فرصت ملی تو اب جرابیں نکالی گئیں۔ جرابیں چڑھائیں۔ "ارے بی ہاتھ ننگے ہیں نگوڑے دستانے نہیں ملتے۔"

بہن: دستانے کیا کرو گی؟

خالہ خوبن: ہاتھ جو ننگے ہیں۔

بہن: ڈاکٹر کو نبض نہیں دکھانی؟

خالہ خوبن: اوئی تو کیا اس غیر مردوئے کو ننگے ہاتھ دکھاؤں گی۔

بھانجی: ہاتھوں پر کپڑا لپیٹ لو۔

خالہ خوبن: سچ کہا۔ موئے چیتھڑے بھی تو اس وقت نہیں ملتے۔

بہن: اے بی کپڑا لپیٹ لو گی تو وہ نبض کیا خاک دیکھے گا۔

خالہ خوبن: کیا کہتی ہو۔

بہن: میں کہتی ہوں کہ نبض نہ دکھانا۔ حال کہہ دینا۔ ڈاکٹروں کو نبض دیکھنی بھی تو نہیں آتی۔

خالہ خوبن: حال سن کر ہی دوا دے گا؟

بہن: ہاں کیوں نہیں۔

خالہ خوبن: حال تم کہہ دو گی نا۔

بہن: مجھے تمہارا حال کیا معلوم۔ جو وہ پوچھے بتا دینا۔

خالہ خوبن: نہیں بی مجھ سے تو بات نہیں کی جائے گی۔ بس تم کہہ دینا کہ پیٹ میں سختی ہے۔ کھانا ہضم نہیں ہوتا۔ گلے میں گٹھلیاں سی ہو گئی ہیں۔ دوسرے تیسرے دن بخار آجاتا ہے۔

بہن: اچھا چلو تو سہی۔

خالہ خوبن نے پہلے دوپٹہ اوڑھا اوپر کا آنچل ٹھوڑی تک بھر چادر لپیٹی۔ اس کے اوپر برقعہ۔ ان کا برقع بھی زمیں بوس ہے۔ ہاتھوں پر کہنیوں تک کپڑا لپیٹا اور بھتّا بن کر چلیں۔ رستے میں ہر قدم پر ٹھٹکتی اور چاروں طرف سے برقع سنبھالتی بدشواری تمام ہسپتال پہنچیں۔ جس ہسپتال میں انہیں لے گئے وہاں کا ڈاکٹر نہائت شریف آدمی تھا اور چونکہ خالہ خوبن کی بہن ڈاکٹر صاحب کی پرانی مریضہ تھیں اس لئے ڈاکٹر صاحب انہیں پہچان کر پوچھنے لگے "کہئے کیا بات ہے"؟

بہن: ڈاکٹر صاحب یہ ہماری رشتے کی بہن ہوتی ہیں۔ غریب لاوارث رنڈیا دکھیا ہیں۔ کئی مہینے سے پیٹ میں سختی ہو گئی ہے۔ کھانا ہضم نہیں ہوتا۔ کھٹی ڈکاریں آتی رہتی ہیں۔ بخار بھی دوسرے تیسرے دن آجاتا ہے اور اب کوئی مہینہ بھر سے گلے میں گٹھلیاں بھی ہو گئی ہیں۔

ڈاکٹر: پیٹ دکھائیے کہاں سختی ہے؟

یہ کہہ کر ڈاکٹر صاحب نے ہاتھ بڑھایا۔ خالہ خوبن نے بھی نبض دکھانے کو کپڑا لپٹا ہوا ہاتھ برقع سے باہر نکالا۔

ڈاکٹر: (خالہ خوبن کے غلاف چڑھے ہوئے ہاتھ کی طرف کچھ خیال نہ کرکے) پیٹ دکھایئے

خالہ خوبن: کیا کہتے ہیں؟

بہن: پیٹ میں سختی کہاں ہے۔ وہ دکھاؤ۔

خالہ خوبن اور پیٹ دکھائیں۔ برقع کو اچھی طرح پیٹ کر سکڑنے لگیں۔

ڈاکٹر: جلدی کیجئے۔ مجھے اتنی فرصت کہاں؟

بہن: ارے بی ڈاکٹر صاحب کا ہاتھ وہاں رکھ دو جہاں سختی معلوم ہوتی ہے۔

خالہ خوبن: (چپکے سے) نوج۔ دور پار مجھے کوئی بازاری عورت سمجھا ہے۔

ڈاکٹر: نہیں دکھائیں؟

بہن: ڈاکٹر صاحب، یہ پرانے زمانے کی آدمی ہیں۔ پیٹ نہیں دکھائیں گی۔

ڈاکٹر: پھر میں دوا کس بات کی دوں۔ کیا خبر جگر بڑھ گیا ہے یا تلی یا پٹھے اکڑ گئے ہیں۔

بہن: اب میں کیا بتاؤں (خالہ خوبن سے) پھر نہیں دکھائیں؟

خالہ خوبن: اونہوں۔

ڈاکٹر: اچھا گٹھلیاں تو دکھا دیں۔

بہن: گلے کی گٹھلیاں تو دکھا دو۔

خالہ خوبن: نہیں بھئی۔ خدا نہ کرے۔

ڈاکٹر: کیوں؟

بہن: گلا دکھانے پر راضی نہیں ہوتیں۔

ڈاکٹر: یہ تو بڑی مشکل ہے۔ علاج کس طرح ہوگا۔

خالہ خوبن: نبض دیکھ لیں۔

اور یہ کہہ کر پھر انہوں نے غلاف چڑھا ہوا ہاتھ برقع سے باہر نکالا۔

ڈاکٹر: (مسکرا کر) اور یہ ہاتھ پر کپڑا کیوں لپیٹ رکھا ہے۔ اسے کھولیئے تو میں دیکھوں

خالہ خوبن: کیا کہتے ہیں؟

بہن: کہتے ہیں کہ ہاتھ کھول کر دکھاؤ۔

خالہ خوبن: نوج بھئی۔ اب میں ان کے سامنے ہاتھ ننگا کروں۔

ڈاکٹر: آپ کی بہن تو بڑے تماشے کی ہیں۔ اچھا زبان تو دکھادیں۔

بہن: (خالہ خوبن سے) زبان تو دکھا دو۔

خالہ خوبن نے بڑی ہچر مچر کے بعد برقعہ میں ایک موکھا سا بنا کر زبان کی نوک باہر نکالی اور پھر جلدی سے اندر کر لی۔

ڈاکٹر: (مسکراتے ہوئے) ان سے کہئے کہ پوری زبان باہر نکالیں۔

خالہ خوبن: کیا کہتے ہیں؟

بہن: کہتے ہیں کہ زبان اچھی طرح باہر نکال کر دکھاؤ۔

خالہ خوبن نے اتنی ہی نوک جتنی پہلے نکالی تھی باہر نکالی اور جھٹ اندر کر لی۔

ڈاکٹر: (تنگ آکر) اب مجھے زیادہ فرصت نہیں اور مریضوں کو دیکھنا ہے۔

بہن: آپ نے حال تو سُن ہی لیا ہے نسخہ لکھ دیجئے۔

ڈاکٹر: آپ کی خاطر سے نسخہ لکھے دیتا ہوں مگر کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

ڈاکٹر نے نسخہ لکھ دیا اور چلے گئے۔

خالہ خوبن: نسخہ لکھ دیا۔ یہ بھی کہہ دیا کہ دوا اچھی دینا۔

بہن: ہاں اچھی ہی دی ہے۔

خالہ خوبن: حال تو سب کہہ دیا نا۔

بہن: ہاں۔

خالہ خوبن: پھر تو جلدی آرام ہو جائے گا۔

بہن: کیوں نہیں۔ مگر تم نے تو نہ پیٹ دکھایا نہ گلا نہ زبان۔

خالہ خوبن: تو بھئی کیا میں ان کے سامنے ننگی ہو جاتی۔

بہن: ننگی کیوں ہو جاتیں۔ ان کا ہاتھ رکھ دیتیں وہ ٹٹول کر دیکھ لیتے۔

خالہ بہن: نہیں بی نوج۔ میرا اتنا بہاؤ نہیں کہ غیر مرد وا مجھے ہاتھ لگائے۔

بہن: خیر تم دوا پینی شروع کرو۔ اللہ مالک ہے۔

دوا لے کر آئیں تو دوا پینے کے نخرے عجیب وغریب تھے۔ کئی کئی پان بن رہے ہیں ناک چڑھتی ہے۔ کبھی منہ بنتا ہے۔ دوا پینے کے بعد ایک لوٹے سے کم میں کلیاں اور غرارے نہیں ہوتے۔ صابن سے زبان دھل رہی ہے۔ عطر کا پھویا ناک کے نتھنوں میں کبھی اِدھر رکھتی ہیں تو کبھی اُدھر۔ ایک پان چبایا اور تھوکا۔ دوسرا چبایا تھوکا۔ بہن تو خیر بُردبار تھیں لڑکیاں چبلا پن کرتیں۔ کوئی کچھ کرتی کوئی کچھ۔ سچ پوچھو تو ان کا ناک میں دم تھا۔ پاخانہ بند۔ غسل خانہ بند۔ باورچی خانے میں اڑیں تو جب تک اپنی ہنڈیا پکا کر نہ اتار لیں۔ کیا مجال کہ کسی دوسرے کی دال گلے۔ پھر لڑکیوں نے ابھی صابن کی ٹکیا منگا کر رکھی ہے دوسرے دن دیکھتی ہیں تو صابن دانی میں پہلی تاریخ کا چاند۔ آخر انہیں ایک دن شرارت سوجھی۔ صبح ہی وہ پاخانے میں تھیں کہ غسل خانے کے حوض کی ٹونٹی کھول دی۔ پانی دھل دھل بہنے لگا۔ صابن کی ٹکیا اُٹھا کر چھپا دی۔ خالی صابن دانی رہنے دی۔ ماں نے کہا بھی کہ ارے حوض کس نے کھول دیا۔ سارا پانی بہہ جائے گا۔ سب سنی ان سنی

کر گئیں۔ اتنے میں خالہ خوبن پاخانے سے آتے ہی اپنی عادت کے موافق غسل خانے میں گئیں "اے ہے حوض کی ٹونٹی کس نے کھلی چھوڑ دی۔ پانی بہہ گیا ہوگا (جلدی سے ٹونٹی بند کر کے) دیکھو آج پورا منہ بھی دھلتا ہے یا نہیں" "ارے بی تمہارے ہاں سقہ پانی کب لاتا ہے ؟"

بہن: اس کے آنے میں ابھی ایک گھنٹہ بھر کی دیر ہے۔

خالہ خوبن: حوض تو خالی ہوگیا۔ میں کس طرح منہ دھوؤں۔

بہن: دیکھو تمہارے منہ دھونے کے قابل تو پانی ہوگا اور نہ ہو تو پینے کے مٹکوں میں سے لے لینا۔

اب خالہ خوبن منہ دھونے بیٹھیں۔ دانت مانجھنے سے پہلے ایک مرتبہ صابن سے کہنیوں تک ہاتھ دھونے لازمی تھے۔ صابن دانی اٹھا کر جو کھولتی ہیں تو صابن ندارد۔ ہوا سی کرچ پڑی ہے۔ بغیر صابن کے بھلا ہاتھ کس طرح دھوئیں۔ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئیں۔ نہ سر سے کھیلتی ہیں نہ منہ سے بولتی ہیں۔ آدھ گھنٹہ بیٹھے بیٹھے گزر گیا۔

بہن: (پاس آکر) کیا کر رہی ہو۔ یہیں بیٹھی رہو گی ؟

خالہ خوبن: کیا کروں ؟

بہن: منہ ابھی نہیں دھویا ؟

خالہ خوبن: کاہے سے دھوؤں۔

بہن: پانی نہیں ہے ؟

خالہ خوبن: پانی نگوڑا تو ہو جائے گا۔

بہن: پھر؟ منہ دھو دھلا کر نکل آؤ۔

خالہ خوبن: یونہی نکل آؤ۔ اوئی بُوا تم بھی چندرانی ہو۔

بہن: آخر کیا بات ہے کچھ کہو تو۔

خالہ خوبن: صابن دانی میں صابن نہیں۔ منہ کس طرح دھوؤں۔

بہن: بالکل خالی پڑی ہے؟

خالہ خوبن: ایک ذرا سی کرچ ہے

بہن: ہو چکا ہوگا (لڑکیوں کو آواز دے کر) کیا صابن ہو چکا۔

لڑکیاں: کل ہی انہوں نے ختم کیا تھا۔

بہن: اتنی بڑی ٹکیا ایک دن میں تمام ہو گئی۔

لڑکیاں: دن میں چار چار دفعہ اور گھنٹوں صابن ملا جائے گا تو ٹکیا صابن کا پہاڑ بھی نہ رہے گا۔

بہن: چیخ کر نہ تو بولو۔ بہرا آدمی بعض مرتبہ ہونٹوں کے ہلنے سے سارا مطلب سمجھ جاتا ہے۔ خیر اب وہ نگوڑی دو چار روز کے لئے تو آئی ہیں صابن منگا لیا ہوتا۔

لڑکیاں: کل سے کوئی لانے والا ہی نہیں آیا منگواتے کس سے۔

بہن: (خالہ خوبن سے) آج خالی پانی ہی سے منہ دھو لو۔ کوئی لانے والا نہیں تھا۔

خالہ خوبن: نہیں بی۔ یہ ساری تمہاری لڑکیوں کی شرارت ہے۔ رات تک تو آدھی ٹکیا تھی۔ انہوں نے چھپا دی خیر۔

بہن: لڑکیو! تم نے واقعی ٹکیا چھپائی ہو تو دے دو۔

خالہ خوبن: اب میں کیا کروں؟

بہن: ایک دن صابن سے منہ دھویا نہ سہی۔

خالہ خوبن : ہاں بُوا ٹھیک کہتی ہو۔

لڑکیاں : اب یہ غسل خانے کا پیچھا چھوڑیں گی بھی ہم سب منہ دھونے کو ہیں۔ ادھر سقہ بھی آنے والا ہے۔ غسل خانہ رُکا ہوا دیکھ کر چلا گیا۔ اُدھر شام تک پانی کو ترسیں گے۔

بہن : اب میں کیا کروں۔ کس طرح کہوں۔ اسی لئے تو کہیں ان کا گذارہ نہیں ہوتا (خالہ خوبن سے) اچھا اب منہ دھو دھلا کر باہر نکل آؤ۔ لڑکیاں منہ دھوئیں گی۔

خالہ خوبن نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چپ چاپ بے حس وحرکت بیٹھی رہیں۔ بڑی دیر کے بعد بڑبڑاتی ہوئی صحنچی میں گیئں جہاں ان کی گٹھری مٹھڑی رکھی تھی۔ بہن باورچی خانہ میں ناشتے کا سامان کر رہی تھیں۔ لڑکیوں میں کوئی منہ دھو رہی تھی تو کوئی کنگھی چوٹی کے شغل میں دیکھا کہ خالہ خوبن برقع اوڑھ رہی ہیں۔ لڑکیوں نے ماں کی طرف اشارہ کیا ماں نے آکر پوچھا کہ اس وقت کہاں جا رہی ہو؟ منہ سے نہ بولیں۔ گٹھڑی سنبھالنے لگیں تو لڑکیوں نے کہا کیا بالکل چلیں۔ ناشتہ تو کر لیا ہوتا۔ کچھ جواب نہیں دیا۔ بہن کو ترس بھی آیا۔ برقع اتروانے کی کوشش کی مگر وہ ہاتھ چھڑا آخر چلی ہی گیئں اور اس دن کے بعد سے پھر انہیں آتے جاتے نہیں دیکھا۔ پندرہ روز ہوئے خدا جانے کہاں ہیں اور کس حال ہیں۔

☆

مُلّا خیرو

مُلّا خیرو قوم کے جلاہے تھے مگر خدا بخشے خاصے پڑھے لکھے اور گفتگو میں تو ایسے تراق پڑاق کہ ایسے ویسے جنٹلمین تو ایک طرف دلّی کے کرخنداروں میں ان کا لوہا مانا ہوا تھا۔ ذرا سی بات کو پھلجڑی کی طرح ایسا چھوڑتے کہ رنگ بہ رنگ کے پھول جھڑتے۔ اوروں کی بابت تو ہم کچھ کہتے نہیں ہمیں تو ان کی باتوں میں بڑا لطف آتا اور ہماری ساری ٹولی میں انہیں بھی مجھ سے کچھ ایسا لگاؤ تھا کہ جب کوئی نیا شوشہ کہیں سے انہیں ہاتھ لگتا فوراً دوڑتے ہوئے آتے اور بغیر مجھے سنائے چین نہ آتا۔

تیس برس پہلے کی بات ہے ایک دن مسجد سے نکل علی الصبح سیدھے میرے پاس آموجود ہوئے

مُلّا خیرو: السلام علیکم

میں: وعلیکم السلام۔ آج صبح ہی صبح کیسے ادھر آگئے۔ کیا رات کو کوئی خواب دیکھا۔

مُلّا خیرو: خواب تو نہیں دیکھا مگر رات بھر پیٹ پھولا رہا ہے۔

میں: کیا کہیں دعوت تھی۔ پلاؤ پر ہاتھ مارے ہوں گے۔ چورن کھا لیا ہوتا۔

مُلّا خیرو: پلاؤ تو نہیں۔ ہاں ایسی چٹ پٹی نئی چیز تھی کہ اب تک ہضم نہیں ہوئی۔

میں: ایسی کیا چیز تھی؟ اور اب آپ کا معدہ بوڑھا ہو گیا ہے ذرا سوچ سمجھ کر کھایا کیجیے۔

مُلّا خیرو: اجی وہ کھانے کی چیز ہوتی تو کیا ہی کہنا تھا۔ سنتے سنتے ہی پیٹ میں درد ہونے لگا۔ اب تمہارے پاس آیا ہوں خدا نے چاہا تو پیٹ ہلکا ہو جائے گا۔

میں: کوئی نیا معاملہ پیش آیا؟

ملّا خیرو: معاملہ واملہ بھی کچھ نہیں۔ وہ جو مسٹر عینک باز ہیں۔ عشاء کی نماز کے بعد گھر جاتے ہوئے جو ان کی بیٹھک کے آگے سے گزرا تو کان میں کچھ آوازیں آئیں ٹھٹک کر سننے لگا۔ ایک صاحب کوئی انگریزی اخبار پڑھ کر اس کا ترجمہ سنا رہے تھے۔ مجھے تو آپ جانتے ہیں ایسی باتوں کی چیٹک ہے۔ پھر اس میں بار بار آزادی کا لفظ جو آیا تو کان لگا دیئے۔

میں: آپ آزادی سے خدا جانے کیوں چڑتے ہیں؟

ملّا خیرو: میں کیوں چڑنے لگا۔ مجھے ہنسی آتی ہے۔

میں: پھر آپ کو ہنسنے سے کون منع کرتا ہے؟

ملّا خیرو: مگر رات کا مضمون سن کر میں بھی قائل ہو گیا۔

میں: تو اب اپنی پرانی عقل پر رو ئیے۔

ملّا خیرو: روئیں میرے دشمن یا وہ نئی روشنی والے جو آزادی کے فراق میں مارے مارے پھرتے ہیں۔

میں: آخر مضمون کیا تھا وہ بھی تو سناؤ۔

ملّا خیرو: اور آیا کس لئے ہوں۔ کیا صرف تمہارا منہ دیکھنے۔

میں: ہاں تو بسم اللہ۔

ملّا خیرو: بسم اللہ یا لاحول ولا قوۃ الّا باللہ۔ اچھا سنئے۔ عقلائے یورپ کا اتفاق ہے کہ ترقی آبادی پر منحصر ہے اور آزادی کے معنی ہیں کہ ہر کام میں حکمتِ عملی کے ساتھ اپنا موجودہ نفع دیکھ کر عقل کی ہدایت پر چلنا۔ کون سی عقل؟ دیسی نہیں ولایتی اور ایمان داری، شرم و حیا وغیرہ کو جو رسم و رواج کی بہ دولت سدِ راہ ہو گئی ہیں۔ نیست و نابود کر دینا — سمجھے جناب؟

میں: بس یہ مضمون تھا۔ اس میں ایسی کیا بات تھی جو رات بھر جناب کے شکمِ مبارک میں قراقُر ہوتی رہی؟

مُلّا خیرو: جلدی نہ کیجئے۔ یہ تو میری اپنی تمہید تھی اور صرف خیال مگر وہاں تو اس کا نتیجہ بھی نکل آیا اور بالکل صحیح۔ کیوں صاحب لیورپول کیا کوئی شہر ہے؟

میں: ہاں۔ انگلستان میں ایک شہر ہے کیوں؟

مُلّا خیرو: وہ اخبار جو پڑھا جا رہا تھا وہیں سے نکلتا ہے۔

میں: اس میں کیا لکھا تھا؟

مُلّا خیرو: لکھا تھا کہ جو لڑکے لڑکیاں بغیر ماں باپ کی کوششوں کے خود بہ خود گھگنائے عدم سے گھبرا کر شاہ راہِ وجود کی طرف بلاحصول پروانۂ راہداری محض تفریحِ طبع کی غرض سے آ نکلتے ہیں۔ ہمارے شہر میں قدم رنجہ فرماتے اور ہمارے مہمان ہوتے ہیں جن کی تعداد سالانہ دو ہزار کے قریب ہے۔ ان کی پرورش و تعلیم کے لیے ہمارا یعنی حضرت مسیح کے اُمتیوں کا فرض ہے کہ نہایت معقول انتظام کیا جائے۔ ان کی مہمان نوازی میں کوئی دقیقہ اٹھا رکھنا گناہِ عظیم ہے

میں: خوب!

مُلّا خیرو: تم ابھی سمجھے ہی نہیں۔ پوچھو کیوں؟ اس خاطر داری پر وہاں کے مذہبی حلقے اتنا زور کیوں دے رہے ہیں؟

میں: واقعی۔ میں سمجھا نہیں۔

مُلّا خیرو: میاں! حضرت عیسیٰ تو صرف بن باپ کے پیدا ہوئے تھے اور عیسائیوں کے بقول خدا کے بیٹے ہوئے لیکن یہ مہمان تو ماں باپ دونوں سے محروم ہوتے ہیں۔ محض بے کسی کے عالم میں اِدھر اُدھر لڑھکنیاں کھاتے دنیا کی تماشا گاہ میں آ نکلتے ہیں۔ پھر انہیں کیا کہیئے گا بھئی یہ

سن کر میری تو عقل چکرا بھی ہو گئی ۔

میں : مگر آپ کو کیوں بے چینی ہوئی ۔

ملا خیرو : تم تو مودھو ہو ۔ ہمارا ان کا فاصلہ ہی کیا صرف ایک سمندر ہی تو بیچ میں ہے ۔ میں تو ڈرتا ہوں کہ کہیں وہ ہوا ادھر نہ آئے ۔ سمندر بھی آزاد اور آزادی جان بھی شکتی ہوئی برابر آگے بڑھتی چلی آتی ہیں ۔ لیکن سنو تو ولایت والوں کی آزادی نے بھی حد کر دی ۔ خلاق العالمین نے فقط ایک حضرت عیسیٰ کو ایسا پیدا کیا جن کے باپ نہ تھے مگر بن ماں باپ کے نہیں ۔ اور یہاں دیکھئے تو آزادی کی یہ دولت بن ماں کے بھی لڑکے لڑکیاں دھڑا دھڑ پیدا ہو رہی ہیں ۔ صدقے اس آزادی کے بونے والے کا پتا نہیں شاخیں دکھائی نہیں دیتیں اور پھل ٹوٹے پڑتے ہیں ۔ اگر رسم و رواج کی قید ہوتی اور مذہب کی پابندی تو ایسی ترقی کہاں سے پاتے اور ایسا لشکر کہاں سے تیار ہوتا جس کے سر پہ کوئی رونے والا نہیں اور لڑتے مرتے وقت یہ خیال بھی نہیں جنہیں بزدل بنا سکتا کہ ہمارے بعد ہمارے بوڑھے ماں باپ پر کیا گزرے گی اور انہیں روٹی کون دے گا ۔

میں : لیکن مولانا ابھی ایک آنچ کی کسر باقی ہے ۔

ملا خیرو : وہ کیا ۔ تم بھی کہہ ڈالو ۔

میں : آزادی تو ہو گئی مگر آزادی میں ابھی دلیری کی روح نہیں پھونکی گئی ۔ کیونکہ بیچ کھیت سرِ راہ ، عام جلسوں اور عبادت گاہوں میں ایسی فوج کے پیدا کرنے کی تخم ریزی ہوتے ابھی تک نہیں سنی ۔ بل ڈوگ اور گرے ہونڈ کو اس وقت تک شرمندہ ہونے کا موقع نہیں ملا ۔

ملا خیرو : اندھیری راتوں میں یہ تماشے بھی ہو جاتے ہوں تو کیا عجب ہے ۔ اس جدید انتظام سے سرِدست ان کی دل دہی اور ہمت بڑھائی گئی ہے اب جو لوگ حالج ہو گئے آئندہ ترقی کریں گے

ہماری رائے ہے کہ لیورپول والی کمیٹی کی طرف سے ایک اشتہار دے دیا جائے کہ جو نیک بخت بن باپ کے بچے کو اپنے گہوارۂ رحم میں لے کر آئے گی وہ بہ مقدار خاص انعام کی مستحق ہوگی۔ پھر دیکھئے کیسی دن دونی اور رات چوگنی ترقی ہوتی ہے۔

مَیں: (ٹھنڈا سانس لے کر) مَیں تو اپنے دیس والوں کے لچھن بھی کچھ ایسے ہی دیکھ رہا ہوں۔ اللہ سے دعا ہے کہ ہمیں تو اس وقت سے پہلے اٹھا لے کہ یورپ کی ہوا کھانے والے یہاں آئیں اور اپنی آزادی جان کے ساتھ کھلم کھلا وہاں کی نقلیں کرنے لگیں۔

ملّا خیرو: آمین۔ ثم آمین!